ڈرامہ انارکلی

امتیاز علی تاج کاڈرامہ انارکلی، حرم سرا کی ایک کنیز نادرہ کی الم ناک کہانی ہے جسے اکبر بادشاہ نے یہ سمجھ کر دیوار میں چنوادیا تھا کہ اس نے شہزادہ سلیم کو اپنے عشق کا فریب دے کر بادشاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نادرہ کو انارکلی کا خطاب اس وقت ملاجب بادشاہ کی منظورِ نظر کنیز، دلآرام کی غیر موجودگی میں اس نے جشنِ نوروز کے موقع پر اپنے رقص اور گیت سے اکبر اور شہزادہ سلیم کو مسحور کر دیا۔

دلآرام کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ قبول تھی کیونکہ ایک طرف تو اس نے اپنامقام کھودیا تھااور دوسری طرف اسے یہ خدشہ تھا کہ اگر شہزادہ سلیم انارکلی سے عشق کرنے لگاتو اس کا ملکہ بننے کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا جو وہ شہزادے کا التفات حاصل کرکے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی۔

شہزادہ سلیم انارکلی کی محبت میں گرفتار ہو گیالیکن انارکلی کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ وہ ایک کنیز ہے اس لیے شہزادے سے محبت کا یہ کھیل اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو گا۔ شہزانے نے اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہو گا اور اس کے جیتے جی انارکلی کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

دلآرام نے پائیں باغ میں انارکلی اور شہزادہ سلیم کو ملاقات کرتے ہوئے دیکھ لیا اور دھمکی دی کہ وہ بادشاہ کو یہ راز بتادے گی۔ شہزادہ سلیم نے دوسرے دن اسے بلا کر اس راز کو راز رکھنے کے عوض دولت کی پیش کش کی تو دلآرام نے اس کے سامنے اپنادل کھول کر رکھ دیا اور کہا کہ وہ بھی اس کی محبت کا طلب گار ہے۔ شہزادے نے اسے جواب دیا کہ اگر اس نے انارکلی اور شہزادے کی محبت کا راز فاش کیا تو بادشاہ کو بتایا جائے گا کہ دلآرام خود شہزادے سے محبت کرتی تھی اور ناکامی پر یہ الزام لگا رہی ہے۔

سلیم کا دوست بختیار جو اتفاقاً وہاں موجود تھا، اس واقعہ کا گواہ بن گیا اور یوں دلآرام وقتی طور پر شکست کھا گئی۔ دلآرام نے بڑی چالاکی سے انارکلی اور شہزدے کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اب ان کے مفادات کا تحفظ کرے گی۔ شہزادے اور انارکلی نے بڑی سادگی سے اس کی بات پر یقین کر لیالیکن ثریا یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ دلآرام مخلص ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بختیار بھی مسلسل شہزادے کو خبر دار کر رہا تھا۔

اکبر نے مہارانی کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد جشنِ نوروز کا انتظام دلآرام کے حوالے کر دیا کیونکہ انار کلی بیمار تھی۔ دلآرام نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک منصوبہ تیار کیا جس کے مطابق اس نے بادشاہ کی نشست کے سامنے والی دیوار پر ایک آئینہ لگوایا تاکہ ضرورت پڑنے پر بادشاہ اس آئینے میں شہزادہ سلیم کو دیکھ سکے جو بادشاہ سے قدرے پیچھے اس کے بائیں طرف بیٹھتا تھا۔ جشنِ نوروز کے دن دلآرام نے مرواید کے ذریعے انار کلی کو ایک نشہ آور مشروب پلا دیا اور انار کلی نے نشے کے عالم میں بڑی بے باکی سے سلیم کی طرف اشارے کر کے گانا شروع کر دیا۔

دلآرام نے اس موقع پر بادشہ کی توجہ آئینے کی طرف دلائی اور بادشاہ نے آئینے میں دیکھ لیا کہ شہزادہ سلیم انار کلی کے اشاروں کو جواب دے رہا ہے۔ صورتِ حال کا انکشاف ہوتے ہی اس نے انار کلی کو قید کرنے کا حکم دیا اور شہزادہ سلیم کو بڑی سختی سے اس کے ایوان میں واپس بھجوا دیا۔

شہزادہ سلیم نے بختیار کے ذریعے داروغہ زنداں کو رشوت دے کر انار کلی سے ملنا چاہا اور جب ملاقات کا اہتمام ہو گیا تو کوشش کی کہ انار کلی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ داروغہ زنداں ایک چالاک انسان تھا۔ اس نے بڑی تجربہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہزادے سے کہا کہ بادشاہ سلامت اس طرف آ رہے ہیں اور یہ درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے داروغہ کے کمرے میں بیٹھ جائے۔ اس نے وعدہ کیا کہ بادشاہ کے جانے کے بعد وہ خود انار کلی کو شہزادے کے ساتھ بھیج دے گا۔ شہزادہ اس کے دام میں آ گیا اور اس کے کمرے میں جا بیٹھا۔ داروغہ نے اسے پانی پلایا اور شہزادہ بے ہوش ہو گیا۔ داروغہ کا مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ شہزادے کو انار کلی لے جانے دیتا تو اسے بادشاہ کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس نے جو رشوت شہزادے سے کی تھی، وہ اس کے لیے مصیبت بن جاتی۔

دوسری طرف اسی رات میں اکبر اپنی خواب گاہ میں بیٹھا تھا۔ رانی نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اکبر انار کلی کو آزاد کرنے پر آمادہ ہو جائے اس کے بعد انار کلی کی ماں نے بھی بہت منت سماجت کی لیکن بادشاہ ان دونوں کو خاطر میں نہ لایا۔ وہ اس واقعہ کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے دلآرام کو بلوایا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ضرور کچھ جانتی ہو گی۔

دلآرام نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے ابتدا میں خوف کا اظہار کیا اور بادشاہ کی دھمکی پر بڑی چالاکی سے اپنا پیشگی دفاع کرنے کے لیے کہا کہ شہزادے نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس عشق کا راز افشاں کرے گی تو جھوٹے گواہوں کی مدد سے اس پر وہ الزام لگایا جائے گا جو واقعات نے انار کلی پر لگایا۔ اپنا دفاع کرنے کے بعد اس نے انار کلی پر یہ حملہ کیا کہ بادشاہ کو

بتایا کہ انارکلی شہزادے کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ بادشاہ کو قتل کردے۔ اس طرح وہ خود ہندوستان کی ملکہ بننا چاہتی تھی۔

انارکلی کی بدقسمتی یہ تھی کہ دشمنوں کی سازش کے ساتھ ساتھ قسمت کی خرابی بھی اس کی موت کے منصوبے میں شریک تھی۔ وہ اس طرح کہ اسی رات داروغہ زنداں بھی سلیم کو بے ہوش کرنے کے بعد اکبر کے پاس حاضر ہوا اور دلآرام کی طرح اپنا دفاع کنے کے لیے پہلے یہ بتایا کہ شہزادے نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے شہزادے کو انارکلی سے ملنے کی اجازت نہ دی تو اس پر الزام لگایا جائے گا کہ اس نے رشوت لی ہے اس طرح اپنا دفاع کرنے کے بعد اس نے بتایا یہ انارکلی نے بادشاہ کی آمد کا سن کر شہزادے سے کہا تھا کہ تلوار نکالو اور دیوار کو گرا دو، جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔

حالات و واقعات کی اس اتفاقی مطابقت اور بدقسمتی نے بادشاہ کو یقین دلادیا کہ انارکلی شہزادے کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی اور اسے بادشاہ کا قتل کرنے پر اکساتی تھی۔ چنانچہ اکبر نے شدید غم و غصے کے عالم میں انارکلی کو زندہ دیوار میں گاڑ دینے کا حکم دے دیا۔ داروغہ نے اسی رات اس حکم پر عمل کیا اور انارکلی دیوار میں چن دی گئی۔

سلیم ہوش میں آیا تو اسے بختیار کی زبانی، انارکلی کی الم ناک موت کا علم ہوا۔ اس نے شدید غم کی کیفیت میں خودکشی کرنے کی خواہش کی اور اکبر کو اپنا باپ ماننے سے انکار کر دیا۔ اکبر کو بھی ثریا کی زبانی یہ علم ہو چکا تھا کہ دلآرام نے سازش کی تھی اور داروغہ زنداں جھوٹا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈرامے کے اختتام پر تمام کردار اور تقدیر کے ستم کا شکار محسوس ہو رہے تھے۔

س: ڈرامہ انارکلی کس کا المیہ ہے۔

1۔ انارکلی 2۔ اکبر 3۔ سلیم

ج: ڈرامے کی روایت میں المیہ ڈرامہ ہمیشہ سے بہت مقبول رہا ہے۔ اس لیے کہ ایک المیہ انسان کا کیتھارسز کرتا ہے۔ یعنی انسان ایک المیہ کے ذریعے اپنے جذبات کا تذکیہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان میں المیہ ڈرامے کے حوالے سے بہت گہری

تحقیق اور تنقید ہوئی۔ ارسطو نے اپنی مشہور کتاب "بوطیقا" میں ایک المیہ کے لیے ضروری قرار دیا کہ یہ جس کردار کا المیہ ہو۔ اس ناتو مکمل طور پر معصوم ہونا چاہیئے اور نہ مکمل گناہ گار۔ اس لیے کہ اگر وہ مکمل معصوم ہو گا تو ہمارے دل میں المیہ جذبات بیدار ہونے کی بجائے، اس کردار کے ساتھ ہمدردی اور غم وغصّے کی کیفیت پیدا ہو گی۔ اور اگر وہ کردار مکمل طور پر گناہ گار ہو گا تو ناظرین کے دل میں اس کے انجام پر ہمدردی کی بجائے یہ تاثر پیدا ہو گا کہ اسے قرار واقعی سزا ملی۔ اس لیے المیہ کے مرکزی کردار کو اس کے جرم سے بہت بڑی سزا ملنا ضروری ہے۔

اگر ہم درج بالا خیالات کی روشنی میں ڈرامہ انار کلی کا جائزہ لیں، تو مرکزی کرداروں میں تین ایسے کردار ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ "انار کلی" ان کا المیہ ہے۔ اکبر، شہنشاہِ ہند ہے اور اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا وہ بیٹا جو اس ک زندگی بھر کی کاوش اور اس کے مستقبل کے خوابوں کا امین ہے، ایک معمولی کنیز کے عشق میں گرفتار ہو کر اسے قتل کرنے پر آمادہ ہے اور بالآخر انار کلی کی موت کے بعد اسے اپنا باپ ماننے سے بھی انکاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس نے شدتِ جذبات میں ایک غلط فیصلہ کر ڈالا لیکن اکبر کے یہ مسائل یہ ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہیں کہ یہ ڈرامہ اس کا المیہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری یہ سوچتا ہے کہ اکبر کا صرف جذباتی نقصان ہوا جو اسے مظلوم ثابت نہیں کر سکتا۔ وقت کے ساتھ حالات تبدیل ہوں گے اور وہ پھر مطمئن ہو جائے گا۔

دوسرا کردار شہزادہ سلیم ہے جو اس مقام کا مستحق ہو سکتا ہے لیکن اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حماقت اور جلد بازی سے وہ صورتِ حال پیدا کی کہ انار کلی کو موت کی سزا مل گئی۔ اس نے بختیار کو سمجھانے کے باوجود دلآرام پر اعتماد کیا اور پھر انار کلی کے قید ہونے کے بعد جلد بازی میں انار کلی سے ملنے لے جانے کی ناکام کوشش کی اور بڑی آسانی سے داروغہ زنداں کے فریب میں آ گیا۔ اس کی ان تمام حرکات سے اسکی ناتجربہ کاری اور بے وقوفی کی حد تک بڑھی ہوئی جذباتیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری سلیم کو انار کلی کی موت کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اس لیے یہ ڈرامہ سلیم کا المیہ نہیں ہو سکتا۔

انار کلی اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھتی ہے کہ وہ ایک کنیز ہے۔ اس لیے کوئی بھی کامیابی اور عروج اس کے لیے بے معنی ہے۔ اس کے دل میں شہزادے کی محبت ہے۔ لیکن وہ اس محبت کو اپنے دل تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ اس محبت کا راز فاش ہونے کی صورت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس کا جرم صرف اتنا ہے کہ نا چاہتے ہوئے بھی، اس نے شہزادہ سلیم کے وعدے پر اعتبار کر لیا اور اپنی سادہ طبیعت کی وجہ سے علاقی سازشوں کا

مقابلہ نہ کر سکی۔ لیکن اسے اس کے اس جرم سے کہیں بڑی اور بھیانک سزا ملی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی موت میں اتفاق اور قسمت بھی شامل تھی کہ داروغۂ زنداں اور دلآرام کے بیانات آپس میں مل گئے۔ چنانچہ انارکلی کے الم ناک انجام کو دیکھتے ہوئے، یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ڈرامہ اسی کا المیہ ہے۔ ایک المیہ ڈرامہ کے اصولوں کے مطابق انارکلی ہی وہ کردار ہے جو اس اعزاز کا مستحق ہو سکتا ہے۔

س2: انارکلی کا کردار

ڈرامہ انارکلی میں مرکزی کردار انارکلی کا ہے۔ وہ اکبر کی شاہی حرم سرا میں ایک کنیز تھی۔ جس کا اصلی نام نادرہ تھا۔ اسے انارکلی کا خطاب اور غیر معمولی شہرت اس وقت ملی جب اکبر کا منظورِ نظر کنیز، دلآرام کی غیر موجودگی میں اس نے جشنِ نوروز کے موقعہ پر اس قدر خوبصورت رقص و سرود کا مظاہرہ کیا کہ اکبر نے اسے بیش قیمت انعامات اور یہ خطاب دیا۔

انار کلی دیکھنے میں ایسی نہ تھی کہ اسے عمومی معیارِ حسن کے مطابق خوبصورت قرار دیا جاسکے۔ مصنف کے بقول اس کی چمپئی رنگت میں اگر سرخی کی خفیف سی آمیزش نہ ہوتی تو بیمار سمجھی جاتی۔ اس کی سب سے بڑی کشش اسکی آنکھیں تھیں جن میں اداسی اور حسرت کا گہرا تاثر نظر آتا تھا۔

اپنے مزاج کے اعتبار سے انار کلی بے حد حساس تھی اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے ناچیز ہونے اور پیدائشی طور پر ایک معمولی کنیز ہونے کا شدید احساس تھا وہ اپنے اونچے مقام اور غیر معمولی شہرت سے بیزار تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح اس نے اپنی پالتو ہرنی لیلی کے گلے میں گھنگھرو باندھ کر اس کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے، اسی طرح اس اونچے مقام اور مرتبے نے اسے بھی ایک تکلیف دہ احساس کا شکار کر دیا ہے۔ وہ اپنے دل میں شہزادہ سلیم سے محبت کرتی تھی لیکن اس محبت کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ شہزادے کو کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن ایک وہم بھی اسے موت کی سزا دینے کے لیے کافی ہو گا۔

انار کلی حساس ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سادہ اور معصوم تھی۔ وہ دل کی اتنی اچھی تھی کہ جب دلآرام نے اس سے معافی مانگی تو اس نے فوراً اسے معاف کر دیا۔ اسکی شخصیت میں ایک خوف کی سی کیفیت تھی۔ وہ حرم سرا اور شاہی محل کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر ایک خوبصورت اور رومانی زندگی جینا چاہتی تھی۔

انار کلی کے کردار کے بارے میں یہ تاثر ملتا ہے کہ ڈرامے میں یہ ایک غیر فعال اور بے جان کردار ہے۔ خصوصاً دلآرام کے مقابلے میں وہ سادہ اور بے وقوفی کی حد تک بھولی نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انار کلی کا ایسا کردار اس ڈرامے کے تقاضوں کے عین مطابق ہے وہ جتنی معصوم سادہ اور محبت کرنے والی تھی، اس کا انجام اتنا ہی بھیانک اور دردناک ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ شہزادے سے محبت کرنے کا یہی انجام ہو گا۔ اس نے اس تمام صورتِ حال سے بچنے کی پوری کوشش بھی کی لیکن شہزادے کے اصرار کے سامنے مجبور ہوتی چلی گئی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تقدیر اسے ایک خاص منزل کی طرف لے جا رہی تھی۔ انار کلی کا کردار جتنا سادہ ہے، دلآرام اتنی ہی زیادہ چالاک ہے انار کلی کی سادگی کی شدت اور اس کے مقابلے میں دلآرام کی چالاکی کی انتہا، اس المیے کے تاثر کو مزید گہرا کرتی ہے۔

اردو ادب میں انار کلی ایک دلکش کردار کے طور پر جانی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ڈرامہ انار کلی اسی کردار کی معصومیت اور مظلومیت کی وجہ سے ایک کامیاب ڈرامہ ہے۔

س 2۔ دلآرام کا کردار

دلآرام ڈرامہ انارکلی کا سب سے جان دار، دلچسپ اور فعال کردار ہے۔ انارکلی کے عروج اور شہرت سے پہلے وہ بادشاہ کی منظورِ نظر کنیز تھی۔ اسے اپنے حسن اور ذہانت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے ذہنی طور پر شہزادہ سلیم کو اپنی محبت کے دام میں پھنسانے اور اس طرح مستقبل میں ہندوستان کی ملکہ بننے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسے عنبر اور مروا کی زبانی انارکلی کی شہرت اور اس کی طرف بادشاہ کے التفات کی خبر ملی تو اس نے بڑی بے چینی سے پوچھا کہ اس محفل میں شہزادہ سلیم تھا یہ نہیں دلآرام کا حلیہ بیان کرتے ہوئے مصنف نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ قیافہ شناسی کی روح سے وہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھی۔ وہ منتقم مزاج تھی چنانچہ جب عنبر نے پوچھا کہ اب تم کیا کرو گی تو اس کا جواب یہ تھا کہ "ناگن کی دم پر کوئی پاؤں رکھ دے تو وہ کیا کیا کرتی ہے"۔

دلآرام غضب کی ہوشیار اور منصوبہ ساز تھی۔ اس نے ابتداء میں سلیم کو مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ انارکلی کی بجائے اس کے ساتھ محبت کرے لیکن جب بختیار کی گواہی کی وجہ سے وہ مجبور ہوگئی، تو اس نے فوری طور پر چال بدلنے کا فیصلہ کر لیا اور شہزادے اور انارکلی کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ بعد آزاں اس نے شہزادے کی اسی دھمکی کو کہ بادشاہ کو بتانے کی صورت میں بختیار کی گواہی کے ساتھ اس پر یہ الزام لگے گا کہ وہ خود شہزادے سے محبت کرتی تھی اور ناکامی ہونے پر انتقام لے رہی ہے، اپنے حق میں استعمال کیا۔ اس نے بڑی حکمتِ عملی سے ایسا انتظام کیا کہ بادشاہ خود اپنی آنکھوں سے سلیم اور انارکلی کی محبت دیکھ لے۔

دلآرام چالاک اور مکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا فلسفیانہ ذہن رکھتی تھی کہ جس کی مدد سے وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکے۔ وہ اپنی اور انارکلی کی کشمکش کو ستاروں کا ٹکرانا قرار دیتی تھی۔ اسکے نزدیک یہ سب قسمت کا کھیل تھا جس میں اس کی اپنی حیثیت ایک مہرے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس ڈرامے میں اس کا کردار بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ ڈرامے کے واقعات اس کی منصوبہ سازی اور منتقم مزاجی کی وجہ سے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنے راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے دوسروں کی نفسیات اور ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا خوب جانتی تھی۔ مثلاً وہ انارکلی کی سادہ لوحی اور نیک فطرت سے واقف تھی اسی لیے اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اسی طرح اسے علم تھا کہ شہنشاہ اکبر سب کچھ برداشت کر لے گا لیکن یہ کبھی

برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی اس کے بیٹے کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرے۔ اسی لیے اس نے انارکلی پر یہ الزام بھی لگا دیا کہ وہ شہزادے کو اکبر کے خلاف بغاوت پر اکساتی تھی۔

مجموعی طور پر یہ کردار اردو ادب کے منفی کرداروں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں تمام الجھنوں کی بنیاد اسی کردار کی وجہ سے ہے اور یہی کردار واقعات کو نقطۂ عروج پر پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکنیکی اعتبار سے یہ کردار اس ڈرامے کا بہترین کردار ہے۔

س3۔ اکبر کا کردار

ڈرامہ انارکلی میں اکبر مرکزی کرداروں میں سے ایک ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک، یہ ڈرامہ اکبر ہی کا المیہ ہے۔ اکبر ہندوستان کا شہنشاہ ہے اور اپنے مقام اور مرتبے کی مناسبت سے شان وشوکت اور طاقت واختیار کا سرچشمہ ہے۔ مصنف نے اس کی شخصیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ زمین کو اپنے قدموں تلے روند رہا ہو۔ اسی طرح اس کی آنکھوں میں ایک ایسی طاقت تھی جو مخاطب کو نظریں جھکا لینے پر مجبور کر دی تھی۔ محل سرا میں موجود ہر شخص اکبر کی ہیبت سے لرزاں براندام رہتا تھا۔

اکبر نے یہ سلطنت اپنی محنت اور جانفشانی سے بنائی تھی اور وہ بجا طور پر اس پر نازاں بھی تھا۔ شہزادہ سلیم کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مہارانی سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ جب وہ خود سلیم کی عمر میں تھا تو وہ پوری سلطنت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کے بارے میں اس کا خواب یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر مغلیہ سلطنت کو اتنا استحکام دینا چاہتا تھا کہ صدیوں تک یہ سلطنت ختم نہ ہو سکے۔ اس نے کہا تھا "زمین سر پھٹک پھٹک کر رہ جائے اور قرن اور صدیاں اس کے سینے سے مغل علم کو نہ اکھاڑ سکیں۔" وہ مستقبل کے بارے میں اپنے اس خواب کی تعبیر سلیم میں ڈھونڈتا تھا۔ سلیم اس کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز و محور تھا۔ اور اس کے نزدیک اس سے زیادہ اہم بات اور کوئی نہیں تھی کہ سلیم میں اس کے باپ دادا جیسی خصوصیات پیدا ہوں۔

اس ڈرامے میں اکبر کا ایک ایسا کردار تشکیل دینے کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اس کی ہیبت اور دہشت کی تصویر کشی کے بعد، اس کی امیدوں اور آرزوؤں کی شدت بیان کی ہے۔ تاکہ انارکلی کے جرم پر اس کا ردِ عمل حق بجانب قرار دیا جاسکے۔ بلاشبہ اس کے لیے اس سے زیادہ افسوس ناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی کہ اس کا بیٹا ایک کنیز کی محبت میں مبتلا ہو کر اس سے باغی ہوجائے۔ وہ اپنے بیٹے سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کی غلطیوں پر سرزنش بھی کرتا تھا لیکن اس کا دل خوش رکھنے کے لیے اسے انعام بھی دیتا تھا۔ لیکن اس کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ اس کا بیٹا ایک کنیز کی محبت میں اتنا دیوانہ ہوجائے کہ اسے اپنے بیٹے کی محبت حاصل کنے کے لیے اس کنیز کا احسان مند ہونا پڑے۔

جب اکبر کو جشنِ نوروز کے دوران سلیم اور انارکلی کے تعلق کا علم ہوا، تو اس کا ردِ عمل بہت شدید تھا۔ لیکن اس نے پھر بھی انصاف کرنے کی کوشش کی۔ دلآرام کو بلانا اس کوشش کا آغاز تھا لیکن انارکلی کی بدقسمتی کی وجہ سے داروغہ زنداں نے بھی ویسا ہی بیان دیا جیسا دلآرام نے دیا تھا۔ دلآرام نے اکبر کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کے لیے انارکلی پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ شہزادے کو اکبر کے قتل پر آمادہ کرتی تھی۔ اکبر شاید اس کا اعتبار نہ کرتا لیکن جب داروغۂ زنداں نے بھی اس بات کی تصدیق کی تو اکبر نے انارکلی کی موت کا حکم دے دیا اور اسے زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔

بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اکبر انصاف نہ کرسکا اور جلد بازی میں غلط فیصلہ کرگیا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے نزدیک شہزادہ سلیم سے زیادہ قیمتی چیز اور کوئی نہیں تھی۔ وہ مغلیہ سلطنت کا مستقبل تھا اور اکبر یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ ایک کنیز مغلوں کی صدیوں پرانی سلطنت کا مستقبل برباد کردے اور ایک بیٹے کو باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرے۔ اس نے انارکلی کی موت کا حکم ضرور دیا لیکن اس حکم میں اکبر کی مرضی سے زیادہ تقدیر کا ہاتھ تھا۔ اکبر کے سامنے اتنے ثبوت موجود تھے کہ انارکلی کی موت کے سوا اور کوئی فیصلہ ممکن نہیں تھا۔

اکبر کو فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی اور وہ ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ مجموعی طور پر اکبر کا کردار بہت اہم ہے اور کچھ نقادوں کے خیال میں اکبر اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے اور یہ ڈرامہ اکبر کا المیہ ہے۔

س 4۔ سلیم کا کردار

ڈرامہ "انار کلی" میں سلیم انار کلی کے مدِ مقابل مرکزی کردار ہے۔ وہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کا بیٹا اور سلطنت کا ولی عہد ہے۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ وارستہ مزاج کا نوجوان ہے۔ جو بے فکری کی زندگی گزار رہا ہے۔ اور شباب کے اولین مراحل میں ہے۔ ڈرامے کے آغاز میں ہے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مزاج بہت رومانی ہے اور وہ ہندوستان کا شہزادہ ہونے کو اپنی بد قسمتی سمجھتا ہے کیونکہ اس مقام اور منصب کی وجہ سے اسے بہت سے اصول وضوابط کا پابند رہنا پڑتا ہے اور اپنے جذبات دبا کر جینا پڑتا ہے اس کا یہ تاثر ڈرامے کے آخر تک قائم رہتا ہے۔

شہزادہ سلیم جانتا ہے کہ انار کلی سے محبت اس کے مقام اور مرتبے کے منافی ہے اور اگر بادشاہ کو اسکی محبت کا علم ہو گیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ اس کے اندر ایک کشمکش ہے جسے وہ اپنے لیے بہت بد قسمتی سمجھتا ہے۔ وہ بختیار سے کہتا ہے:

"نحس تھی وہ ساعت جب تیرہ بختی نے مجھے دودمانِ مغلیہ کا ولیعہد کر دیا اور اس سے زیادہ نحس تھا وہ لمحہ جب انار کلی کی حیران نظروں نے اس دل کو ایک انگارہ بنا دیا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ سلیم بھی بختیار کی طرح اس حقیقت سے واقف تھا کہ انار کلی سے محبت کا نتیجہ الم ناک ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور اسے اپنے عشق پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

سلیم نے عشق کی رو میں بہہ کر انار کلی کو یقین دلایا کہ اس کے جیتے جی انار کلی کو کچھ نہ ہو گا۔ لیکن اپنی ناتجربہ کاری اور جذباتیت کی وجہ سے اس نے کچھ ایسے قدم اٹھائے، جو انار کلی کے الم ناک انجام میں ممد و معاون ثابت ہوے اس نے دلآرام کو وقتی طور پر خاموش کر دیا۔ لیکن بختیار کے سمجھانے کے باوجود دلآرام پر دوبارہ اعتماد کر لیا اس کا یہ اعتماد دلآرام کے لیے ایک پردہ ثابت ہوا جس میں چھپ کر وہ سازش کرنے میں کامیاب ہو گئی اسی طرح جب انار کلی کو قید کر دیا گیا، تو بختیار نے سلیم کو پر سکون رہنے اور کوئی بھی قدم نہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔ لیکن سلیم نے اپنی ضد ار جلد بازی کی وجہ سے داروغہِ زنداں کو رشوت دے کر انار کلی سے ملاقات کی اور اسے وہاں سے لیجانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر بھی اس کی ناتجربہ کاری انار کلی کے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور وہ داروغہِ زنداں کے ہاتھوں بے ہوش ہو کر وہیں پڑا رہا اور انار کلی کے خلاف داروغہِ زنداں کی صورت میں ایک اور گواہ فراہم کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم انار کلی سے سچی محبت کرتا تھا اور کی خاطر تاج و تخت ٹھکرا دینے پر تیار تھا لیکن اس کی حکمتِ عملی میں کسی بھی مقام پر دانائی نظر نہیں آتی۔ بختیار دراصل وہ کردار ہے جو قدم قدم پر ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ سلیم کو کیا کرنا چاہئے تھا۔ یعنی اول تو اسے انار کلی کے عشق میں کود پڑنے کی بجائے ایک مدبر بادشاہ بننے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ پھر دلآرام

کو وقتی شکست دینے کے بعد اسکی طرف سے بے حد محتاط رہنا چاہئے تھا اور آخر میں جب انار کلی قید ہو گئی تھی تو صبر و تحمل اور بردباری سے شہنشاہ پر سچائی واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی لیکن اس نے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے دلآرام کو سازش کرنے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا موقع فراہم کر دیا۔

تکنیکی طور پر یہ کردار بظاہر بے عمل اور کمزور نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شہزادہ سلیم کا لاابالی مزاج، اس کی لاپروائی اور اسکی کی وارستہ مزاجی انار کلی کے المیے کو بھرپور اور شدید بنا دیتی ہے اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس ڈرامے کا ایک کامیاب کردار ہے۔

س 5۔ بختیار کا کردار

ڈرامہ "انار کلی" میں بختیار شہزادہ سلیم کا مخلص دوست اور مص۔ وہ ایک "خوش طبع نوجوان ہے جس کی آنکھوں میں خلوص چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔" ابتدا ہی سے وہ ایک ناصح کا کردار اپناتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سلیم کو مشورہ دیتا ہے کہ: مغلوں کو مدبر بادشاہوں کی ضرورت ہے۔ وہ شاعر بادشاہ نہیں چاہتے۔" سلیم کا مصاحب ہونے کی حیثیت سے اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ سلطنت اور شہنشاہ کے حق میں یہ بہتر نہیں ہے کہ سلیم کنیزوں سے عشق کرتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلیم بڑی وارفتگی سے انار کلی کا ذکر کرتا ہے اور اپنے دلیعبد ہونے کو منحوس قرار دیتا ہے تو بختیار اس کی طرف ہمدردی کی نظروں سے دیکھتا ہے۔

اپنے فرض کے احساس کے ساتھ ساتھ بختیار کے دل میں سلیم کی اتنی محبت ہے کہ وہ اس کی خوشی کے لیے اپنی عقل، اپنی سمجھ داری اور اپنی حکمتِ عملی پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ وہ ہر قدم پر شہزادے کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے عشق میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اسے نصیحت بھی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح بختیار باطنی سطح پر ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ شہزادہ انار کلی سے ملے پھر بھی دوستی کی خاطر اس کی مدد کرتا ہے۔ جب دلآرام یہ جان لیتی ہے کہ سلیم اور انار کلی آپس میں محبت کرتے ہیں، تب بھی بختیار اسے یہی مشورہ دیتا ہے کہ ابھی وقت ہے، یہ سلسلہ چھوڑ دو وہ اسے سمجھاتا ہے کہ ایک غلطی کرنے کے بعد دوسری غلطی مت کرو اور اسے واسطہ دیتا ہے کہ وہ "ظل الٰہی کی خاطر مغلوں کی خاطر اور خود انار کلی کی خاطر اسے بھول جائے "لیکن اس کی دوستی کی خاطر داروغہ زنداں سے مل کر انار کلی کے ساتھ اس کی ملاقات کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ اس طرح وہ مسلسل ایک کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔

اس ڈرامے میں بختیار کا کردار اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ وہ شہزادہ سلیم کے کردار میں موجود خلا پُر کرتا ہے وہ حکمت، دانائی اور تدبر جس کی شہزادے میں کمی نظر آتی ہے، بختیار میں موجود ہے۔ اس ڈرامے میں اگر کوئی کردار دلآرام کی سازشوں اور مکاریوں کا مقابلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہے تو وہ بختیار کا کردار ہی ہے۔ اگر شہزادہ سلیم اس کے مشوروں پر عمل کرتا رہتا تو شاید انارکلی کا یہ انجام نہ ہوتا لیکن شہزادے کی ضِد اور اصرار پر وہ مجبور ہو کر وہ سب کچھ کرتا رہا جو اس کے نزدیک غلط تھا۔ اس کی یہ بے بسی اس المیے کے تاثر کو مزید گہرا کرتی ہے۔ وہ ایک پُر خلوص دوست تھا جو نہ صرف شہزادے کا ہمراز تھا بلکہ اس کا مزاج شناس بھی تھا۔ اس کی موجودگی شہزادے کے لیے ایک سہارے سے کم نہیں تھی۔

انارکلی کے الم ناک انجام کے بعد جب شہزادہ ہوش میں آیا تو اس تک سب سے پہلے پہنچنے والا اس کا دوست بختیار ہی تھا۔ بختیار نے بڑے دکھ کے ساتھ اسے انارکلی کی موت کی خبر سنائی اور اسے سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کردار اس ڈرامے کا ایک جاندار کردار ہے جو اپنے نیم مزاحیہ انداز، اپنی حکمت و دانائی، اپنے خلوص اور اپنی فرض شناسی کی وجہ سے بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

مزاج میں رومانیت: دلآرام کی تعریف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سلیم کے رتبے کا لحاظ کرتا ہے۔

ثریا کا کردار:

ڈرامہ انارکلی میں ثریا انارکلی کی چھوٹی بہن ہے۔ وہ ایک شوخ اور تیز مزاج لڑکی ہے جس کے نقوش انارکلی کی نسبت زیادہ خوبصورت ہیں لیکن ان میں انارکلی جیسی کشش نہیں۔ وہ حرم سرا میں رہتی ہے اور دوسروں کی باتیں سن کر اپنی عمر سے زیادہ سیانی ہو چکی ہے۔

ثریا کا کردار اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ وہ انارکلی اور سلیم کے درمیان رابطے کا باعث بنتی ہے اور اپنی بے باکی سے وہ فاصلہ بہت جلد سمیٹ دیتی ہے جسے طے کرنے میں سلیم اور انارکلی کو بُہت زیادہ وقت درکار تھا۔ ثریا اپنی بہن سے بے حد محبت کرتی ہے اور اسے مستقبل کے ہندوستان کی ملکہ دیکھنا چاہتی ہے۔ شہزادہ سلیم کے پیغام انارکلی تک پہنچاتے ہوئے، وہ بُہت پُر جوش نظر آتی ہے اور اس بات کا اظہار بھی کرتی ہے کہ انارکلی مستقبل کی ملکہ بنے گی۔ ناتجربہ کاری اور کم عمری کی وجہ سے اس میں ابھی وہ چالاکی اور مکاری نہیں آئی کہ وہ اپنے تاثرات پر قابو پا سکے۔

ثریا ایک ایسا کردار ہے جو دلآرام کے مقابل آسکتا تھا۔ وہ واحد لڑکی تھی جس نے دلآرام کی مکاری پہچان لی تھی۔ اور سرِعام اسے کہہ دیا تھا کہ وہ انارکلی کو بے وقوف بنا سکتی ہے لیکن ثریا کو نہیں شہزادہ سلیم اور انارکلی دونوں نے دلآرام پر اعتماد کر لیا لیکن ثریا

کو اس پر شک تھا جو دور نہ ہو سکا۔ اس نے اپنی بہن کو بھی سمجھانے کی کوشش کی لیکن اسکی اتنی عمر اور حیثیت نہیں تھی کہ وہ اپنی بات منوا سکتی۔

اس ڈرامے میں ثریا کا کردار ہر حوالے سے بہت اہم ہے۔ انار کلی کی بے عملی اور اس کے خوف کے مقابلے میں ثریا ہوشیار اور بہادر ہے۔ انار کلی شہزادے کے اتھ محبت کرنے کا منفی پہلو دیکھتی ہے جبکہ ثریا اس عشق کے مثبت پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ اس طرح ثریا انار کلی کے کردار کی کمزوریاں اجاگر کرتی ہے اور انار کلی میں جرت اقدام کی کمی کی تلافی کرتی ہے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر ثریا در حقیقت اس کہانی کا ایک خلا پر کرتی ہے۔

ثریا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی اس کی بہادری اور بے باکی ہے۔ ڈرامے کے آخری باب میں انار کلی کی موت کے بعد جب وہ سلیم کے ایوان میں آتی ہے تو بڑی بے باکی سے سلیم کو بزدل اور بے غیرت قرار دیتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ کس طرح انار کلی کو دیوار میں چن دیا گیا اور سلیم اپنے آرام دہ محل میں سوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب اکبر بادشاہ حقیقتِ حال کو علم ہونے پر یہ کہتا ہے کہ دلآرام اور داروغہ سے انتقام لیا جائے گا تو ثریا بڑی بے باکی سے شہنشاہِ ہند کے سامنے اسے کہتی ہے کہ انتقام تم سے کیوں نہ لیا جائے جس نے یہ ناانصافی کی۔ اس حوالے سے یہ کردار در حقیقت قاری کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے وہ سب کچھ جو قاری کہنا چاہتا ہے۔ اس کردار کی زبانی کہلوایا جاتا ہے۔

س 7۔ انار کلی کے ذیلی کردار بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کے مرکزی کردار۔ تبصرہ کریں۔

ڈرامہ انار کلی میں اکبر، سلیم، انار کلی اور دلآرام مرکزی کردار ہیں جبکہ بختیار، ثریا، مہارانی، داروغہِ زنداں، انار کلی کی ماں، عنبر، مروارید، ستارہ اور زعفران ذیلی کردار ہیں۔ اس ڈرامے میں یہ ذیلی کردار بھی اتن ہی اہمیت رکھتے جتنی کہ مرکزی کردار۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ڈرامے کی فضا برقرار رکھنے اور مختلف پہلوؤں سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں یہ کردار معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ان ذیلی کرداروں میں داروغہِ زنداں کا کردار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کردار کا حلیہ اس کی چالاکی اور اکبر کے سامنے اس کا جھوٹا بیان انار کلی کی مظلومیت اور موت کا بُہت بڑا سبب ہے۔ داروغہِ زنداں دلآرام کا ساتھی نہیں تھا لیکن محلاتی سازشوں کی پروردہ ذہنیت اس کی میراث تھی۔ چنانچہ جب سلیم نے اسے رشوت دے کر انار کلی سے ملنا چاہا اور پھ انار کلی کو بزورِ شمشیر وہاں سے لیجانا چاہا تو داروغہِ زنداں نے پہلے بڑی عیاری سے سلیم کو بے ہوش کیا اور پھر اکبر کے سامنے دلآرام ہی کے انداز میں یہ بیان دیا کہ سلیم نے اسے دھمکی دی تھی کہ تعاون نہ کرنے کی صورت میں اس پر رشوت خوری کا الزام لگایا جائے گا اور ساتھ یہ

بھی اضافہ کر دیا کہ انارکلی سلیم کو بادشاہ کے قتل اور بغاوت پر آمادہ کرتی تھی۔ اس طرح داروغہ نے نہ صرف انارکلی کی موت کا سامان کیا بلکہ اس کے بیان کا دلآرام کے بیان سے اتفاقاً ملنا انارکلی کی موت میں تقدیر کے ہاتھ کی نشان دہی کرتا ہے۔

بختیار کا کردار اس حوالے سے اہم ہے کہ وہ سلیم کی ناتجربہ کاری اور سادگی کی تلافی کرتا ہے۔ وہ ہر قدم پر قاری کو احساس دلاتا ہے کہ سلیم کا ردِ عمل کیا ہونا چاہئے تھا۔ جب دلآرام پہلی بار سلیم کے سامنے بے بس ہوتی ہے تو وہ اسے سمجھاتا ہے کہ یہ وقتی فتح ہے وہ اسے انارکلی کے عشق سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے سمجھاتا ہے کہ قید خانے میں انارکلی سے ملنا مناسب نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بختیار کا کردار قاری کے ذہن میں موجود خدشات اور لائحہ عمل کی نشان دہی کرتا ہے۔

ثریا کا کردار اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ سلیم اور انارکلی کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے علاوہ یہ کردار قاری کے جذبات کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ جشنِ نوروز کے موقع پر ثریا سلیم کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ دلآرام پر بھروسہ نہ کرے۔ یہ درحقیقت قاری کے دل کی آواز ہے۔ اسی طرح جب انارکلی کو موت کی سزا دے دی جاتی ہے تو ثریا قاری کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہوئے سلیم اور اکبر کو ان کی غلطیوں اور ناانصافیوں پر سخت سست کہتی ہے۔

ان تینوں کرداروں کے علاوہ ستارہ اور زعفران کا کردار ڈرامے میں بوجھل فضا کو خوش گوار بناتا ہے۔ عنبر اور مروارید دلآرام کے منصوبے میں معاون ہیں۔ انارکلی کی ماں مظلومیت اور بے بسی کی تصویر ہے۔ مہارانی اکبر کی ذہنیت اور اس کے خوابوں اور منصوبوں کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور کافور جیسے خواجہ سرا شاہی محل اور غلام گردشوں کا ماحول مکمل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ تمام کردار مل کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو ایک المیے کو حقیقی تصویر کی طرح پیش کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ کہنا بجا ہے کہ اس ڈرامے کے ذیلی کردار بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ مرکزی کردار۔

ڈرامہ انارکلی مغلیہ تہذیب کا مرقع ہے۔ تہذیب کے ظاہری اور باطنی مظاہر کے حوالے سے بیان کریں۔

ڈرامہ انارکلی میں مصنف امتیاز علی تاج نے مغلیہ عہدِ حکمرانی کے تہذیبی مظاہر کو ڈرامہ کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ ڈرامہ ایک المیہ ہے اور اس المیہ کے تاثر کا گہرا کرنے کے لیے مصنف نے ایک بے بس اور مجبور کنیز کے بالمقابل ایک شان شوکت اور ہیبت رکھنے والا بادشاہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ بادشاہت اور سلطانی سے وابستہ ظاہری اور باطنی عناصر کا بیان بڑی تفصیل سے نظر آتا ہے۔

ظاہری سطح پر ڈرامے کے مناظر، ماحول، کرداروں کے لباس، حلیے، اندازِ نشست وبر اخاست اور طرزِ گفتگو میں مغلیہ تہذیب جھلکتی ہے۔ ڈرامے کا آغاز حرم سراہ کے ایک منظر سے ہوتا ہے۔ حرم اسرا کا تصور بذاتِ خود شہنشاہیت اور ملوک سے وابستہ ہے۔ حرم سرا میں رقص وسرود کی محفلیں سجانے والی رقاصائیں، کنیزیں اور غلام رکھے جاتے تھے جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ بادشاہ کی دل بستگی اور لطف وسرور کے لیے نت نئے سامان کریں اس سزا کو شام بحرے تیار کیے جاتے تھے، پھولوں کا انتظام ہوتا تھا، موسیقی اور راگ رنگ کی محفلیں سجانے پر توجہ دی جاتی تھی اور یہ تمام کام روز مرہ کے معمول کی طرح انجام دیے جاتے تھے۔

شاہی محل کی عمارت اور اس کے باغات بھی مغلیہ طرزِ تعمیر اور ان کے ذوق کی ترجمان ہیں۔ سلیم کا ایوان، غلام گردشیں، صحرابی دروازے، ستون، شہہ نشینی اور تخت وتاج سب مغلیہ تہذیب کے غماز ہیں۔ کمروں کی تزئین و آرائش کے مناظر بھی مغلیہ تمدن کی یاد دلاتے ہیں۔ اکبر کی خواب گاہ کا منظر بہت خوبصورت ہے۔ دیواروں پر پڑے ہوئے زربفت اور کمخواب کے پردے اور ماہی پشت انداز کی چھت، دریچے اور چلمنیں یہ سب کچھ قاری کو اس دور میں لے جاتا ہے جب مغلیہ حکومت کا عالم بہت بلند تھا۔

جشنِ نوروز کے موقع پر تیاری کا منظر بیان کرتے ہوئے امتیاز علی تاج نے مغلیہ تہذیب و تمدن کا نقشہ بڑی وضاحت سے کھینچا ہے۔ کنیزوں کے لباس، محل کی سج دھج درو دیوار کی تزئین و آرائش اور سب سے بڑھ کر شیش محل کا منظر مغلیہ تمدن اور شان و شوکت کا غماز ہے۔

"انارکلی" میں مغلیہ تہذیب کی ظاہری تصویر کشی کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کے باطنی خدوخال بھی نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر مطلق العنان اور حکم علی الاطلاق بادشاہوں کے گرد وپیش پایا جانے والا ماحول مغلیہ دور کا خاص تصور ہے۔ اس دور میں بادشاہ شان وشوکت اور اپنے مقام و مرتبے کی مناسبت سے طاقت واختیار کا سرچشمہ تھے۔ اکبر کا کردار اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا رعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ پورے محل کی ہر شے اور ہر انسان اس کی دہشتسے لرزاں بر اندام رہتا تھا۔ اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے زمین کو اپنے قدموں تلے روند دیا ہو۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی طاقت تھی جو مخاطت کو نظریں جھکا لینے پر مجبور کرتی تھی۔ بادشاہ کی دہشت کے علاوہ محلاتی سازشوں کا تانا بانا بھی ڈرامے کی فضا کو بھرپور بناتا ہے۔ خاص طور پر داروغہ کا کردار اس بات کی نشان دہی کرتا ہے۔ داروغہ دلآرام کا ساتھ نہیں تھا لیکن محلاتی سازشوں کی پروردہ ذہنیت اس کی میراث تھی جو اسکے جھوٹے بیان کی بنیاد ثابت ہوئی۔ باطنی مظاہر کا ایک انتہائی اہم پہلو طبقاتی تقسیم بھی ہے۔ انارکلی ایک کنیز کی تصویر پیش کرتی ہے جو اس ناگوار حقیقت سے واقف تھی کہ تمام صورتِ حال کا انکشاف ہونے پر شہزادے کو کوئی کچھ

نہیں کہے گا لیکن اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔ یہ جبر اور طبقاتی تقسیم اس دور کی مغلیہ تہذیب کا ایک الم ناک لیکن اہم حصّہ تھا۔

مجموعی طور پر یہ کہا جائے تو محرابی دروازوں اور شہہ نشینوں سے لے کر مغلیہ طرزِ گفتگو تک، رقاصائیں، کنیزیں، بادشاہ اور شہزادے کے مصاحب، غلام اور کافور جیسے خواجہ سرا شاہی محل اور غلام گردشوں کا ماحول مکمل کرتے ہیں۔ انارکلی کی ماں اور خود انارکلی بے بسی اور مظلومیت کی تصویر پیش کرتی ہے اور بختیار ان دانا مصاحبوں کی نمائندگی کرتا ہے جو بادشاہ اور شہزادوں کے ناصح بھی ہوتے تھے۔ الغرض امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انارکلی" مغلیہ دورِ حکومت کے ظاہری اور باطنی مظاہر کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

س: ثریا اور بختیار کے کرداروں کی اہمیت۔ مشترک کیا ہے؟

ج: ڈرامہ "انارکلی" میں ثریا اور بختیار ذیلی کردار ہیں۔ ثریا انارکلی کی شوخ اور تیز مزاج چھوٹی بہن ہے جو شہزادہ سلیم اور انارکلی کو ملانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ اپنی بے باکی اور شوخی کے تحت سلیم اور انارکلی کے بیچ کا فاصلہ بہت جلد سمیٹ دیتی ہے

جس کو بہت وقت درکار ہوتا۔ ثریا انارکلی سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اسے ہندوستان کی ملکہ بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ بختیار سلیم کا جگری دوست اور مصاحب ہے۔ وہ "ایک خوش طبع نوجوان ہے جس کی آنکھوں میں خلوص چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔" ڈرامہ کی ابتدا سے ہی وہ ایک ناصح کا روپ اپناتے ہوئے نظر آتا ہے۔ وہ سلیم کو تنبیہہ کرتا ہے کہ وہ انارکلی سے محبت چھوڑ دے اور ایک مدبر بادشاہ بننے کی کوشش کرے۔ اس نے سلیم کو کہا تھا کہ "مغلوں کو مدبر بادشاہوں کی ضرورت ہے وہ شاعر بادشاہ نہیں چاہتے۔"

ثریا اور بختیار کے کرداروں کی ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں کردار انارکلی اور سلیم کے کرداروں میں موجود خامیوں کی تلافی کرتے ہیں اور یوں قاری کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ثریا کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انارکلی کی بے عملی اور اس کے خوف کے مقابلے میں ثریا ہوشیار اور بہادر ہے۔ انارکلی شہزادے سے مھبت کا محض منفی پہلو دیکھتی ہے جب کہ ثریا اس کے مثبت پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ اور یوں انارکلی کے کردار میں جرات اقدام کی کمی کی تلافی ثریا کرتی ہے اور اس کے کردار کی تمام تر کمزوریاں اجاگر کرتی ہے۔

اسی طرح بختیار شہزادہ سلیم کے کردار میں موجود خلا پر کرتا ہے جس تدبر، دانائی، حکمتِ عملی اور ہوشیاری کی کمی شہزادہ سلیم میں ہے وہ سب بختیار مین موجود تھی۔ بختیار در حقیقت وہ کردار ہے جو قاری کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ڈرامے کے ہر موڑ پر سلیم کا کیا ردِ عمل ہونا چاہئے۔ یعنی کہ ایسے انارکلی کے عشق میں کود پڑنے کی بجائے ایک مدبر بادشاہ بننے کی کوشش کرنی چاہئے تھی اور جب دلآرام کو وقتی شکست دی گئی۔ تو اسے اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہئے تھا۔ اسی طرح جب انارکلی کو قید خانے میں بند کیا گیا تو سلیم کو جلد بازی کی بجائے صبر سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کو تمام صورتِ حال کا حقیقی رُخ پیش کرنا چاہئے تھا۔

ثریا اور بختیار کے کردار اس لیے بھی اہم ہیں کہ پورے ڈرامے میں محض یہی کردار دلآرام کی چالاکی اور منصوبہ بندی کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ بختیار یہ جانتا تھا کہ دلآرام جلد شکست تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں ہے لہذا وہ سلیم کو مسلسل محتاط کرتا رہا۔ ثریا بھی اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ دلآرام ہر گز کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہوسکتی۔ اس نے سرِ عام دلآرام کو کہا تھا کہ وہ انارکلی اور سلیم کو تو بے وقوف بنا سکتی ہے۔ لیکن ثریا کو نہیں۔ جشنِ نوروز کے موقع پر اس نے ایک مرتبہ پھر سلیم کو دلآرام سے بچنے کی نصیحت کی لیکن اپنی کم عمری اور حیثیت کی وجہ سے وہ اپنی بات منوا نہ سکی۔

ثریا اور بختیار کے کردار قاری کے جذبات کی نمائندگی بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں۔ جو خدشات قاری کے ذہن میں ہوتے ہیں، وہ تمام خدشات سے سلیم کو بختیار ہی آگاہ کرتا ہے۔ اسی طرح ثریا بھی قاری کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے جب شہنشاہ اکبر تمام صورتِ حال کا انکشاف ہونے پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہے کہ دلآرام اور داروغہ سے بدلہ لیا جائے تو ثریا بے دھڑک اور بلا جھجک بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہے کہ بدلہ تم سے کیوں نہ لیا جائے جس نے یہ ناانصافی کی۔

ذیلی کردار ہونے کے باوجود ثریا اور بختیار کے کردار ڈرامے کی فضا کو بھرپور بنانے میں نمایاں نظر آتے ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ممدود و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ

علی گڑھ تحریک کی خشک مقصدیت کے اور اردو ادب میں رومانی تحریک سامنے آئی جو اس مقصدیت کا ردِ عمل تھی۔ اقبال کی شاعری مقصدیت اور رومانیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ انہوں نے قومی سطح پر تعمیرِ ذاب کے ذریعے انسانی زندگی کی عظیم ترین مقصد کی تبلیغ بھی کی اور تخیل کی آزاد پرواز میں کھ کر "ہمالہ" اور "ایک آرزو" جیسی نظمیں بھی تخلیق کیں۔

اقبالؔ نے اسل ملی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک مربوط فلسفہ پیش کیا جس میں انسان کی شخصیت اور تعمیر کے لیے خودی کی پہچان اور خودی کی تعمیر پر زور دیا۔ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں بے مقصد پیدا انہیں کیا گیا بلکہ اس کی ذات میں موجود امکانات کی آزمائش کے لیے یہ دنیا تخلیق کی گئی اور اس دنیا میں موجود تمام فطری مظاہر انسان کے استعمال میں دے دیے گئے تاکہ وہ اپنی کوشش سے اس دنیا ک قلم کرے اور اپنی خودی کی تعمیر کے ذریعے اپنے خالق کے قریب تر ہو جائے۔ نصاب میں شامل نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" میں انہوں نے انسان کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ اپنی بے مثال صلاحیتوں کے ذریعے اس دنیا کی تمام اشیاء کو اپنے حق میں استعمال کرے۔

ہیں تیرے تصر میں یہ بادل یہ گھٹائیں

یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ سحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں

تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اقبال کے فلسفے میں تصوف کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ مولانا روم کے روحانی مرید تھے اور اس دنیا میں انسان کے وجود اور اس کے ہونے کو اسی نظریے سے دیکھتے تھے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں زندگی کا یہ تصور پیش کیا کہ انسان کی زندگی صرف وہ نہیں جو دنوں کے آئینے میں نظر آتی ہے بلکہ انسان کی زندگی ایک ازلی اور ابدی تسلسل کا نام ہے۔ جو انسان اپنی ذات کی تعمیر کرتا ہے اور اس ازلی اور ابدی تسلسل میں اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتے ہوئے اپنے ہون کا جواز فراہم کرتا ہے وہی زندہ انسان انسان کہلانے کے لائق ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اقبال کے ہاں رومانیت کا ایک روایتی تصور بھی ملتا ہے۔ اردو شاعری میں ہمیشہ شہری زندگی اور اس کے لگے بندھے اصولوں سے بیزاری ظاہر کی جاتی رہی ہے۔ مومن نے کہا تھا۔

کر علاجِ وحشتِ غم چارہ گر

لادے اک جنگل مجھے بازار سے

اقبال نے بھی اپنی نظم ایک آرزو میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے کہ شہری زندگی سے دور کسی پہاڑ کے دامن میں ایک الگ تھلگ اور دور افتادہ مقام پر فطرت کی آغوش میں گزاری جانے والی زندگی شہری زندگی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔

مرنا ہو خامشی پر یہ آرزو ہے میری

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا!

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں

دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

مجموعی طور پر اقبال نے بیسیوں صدی میں شاعری کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ انہوں نے مقصدیت اور رومانیت کو آپس میں ملا دیا اور فلسفیانہ شاعری میں وہ خوبصورتی پیدا کی جو ماضی کی خالص عشقیانہ شاعری میں بھی نظر نہیں آتی تھی۔

ساحر لدھیانوی

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر بہت سے ایسے شاعر سامنے آئے جنہوں نے جاگیردارانہ نظام او معاشرے میں موجود طبقاتی کشمکش کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں ساحر لدھیانوی بہت نمایاں شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی بہت مشکل حالات میں گزاری۔ ایک جاگیر دار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان کے جاگیردار باپ نے ان کی ماں کے ساتھ بہت ناانصافی کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے معاشرے میں موجود جاگیر دار اور بااختیار طبقے کو غدار سمجھتے تھے اور اپنی شاعری میں اس بات کا برملا اظہار کرتے تھے کہ غدر سے لے کر اب تک ہمارے اباؤ اجداد نے ہر مشکل وت میں غیر ملکی حکمرانوں کی مدد اور حمایت کی ہے۔ یہی تلخی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کے مجموعے "تلخیاں"، "پرچھایاں"، "آؤ کچھ خواب بنیں" اور "گاتا جائے بنجارہ" ایسی ہی تند و تلخ شاعری سے بھرے ہوئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ساحر لدھیانوی ہندوستان میں فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے اور گیت لکھ کر روزگار کا بندوبست کرتے رہے۔ انہیں اس پیشے سے ہمیشہ شکایت رہی انہوں نے اپنی نظم "فنکار" میں اس دکھ کا اظہار کیا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے ان کو اپنے گیت بیچنا پڑتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

دیکھ اس عرصہ گاہِ محنت و سرمایہ میں

میرے نغمے ہی میرے پاس نہیں رہ سکتے

تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی

تیرے خاکے بھی میرے پاس نہیں رہ سکتے

ساحر لدھیانوی نے اپنے دور میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف بڑی شدت سے آواز بلند کی اور معاشرے کے مروجہ تصورات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور چیزوں کو ان کے حقیقی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اپنی نظم "تاج محل" میں انہوں نے یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ وہ لوگ بھی انسان تھے جنہوں نے یہ تاج محل تعمیر کیا تھا۔ ان کے جذبے بھی سچے تھے اور

انہوں نے بھی محبت ی تھی لیکن ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اپنی محبت کی کوئی علامت بنا سکتے۔ اس بنیاد پر ساحر تاج محل کو محبت کی علامت کی بجائے غرور اور خود پسندی کی علامت قرار دیتے ہوئے اپنی محبوبہ کو وہاں آنے سے روک دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل

یہ منقش درو دیوار، یہ محراب، یہ طاق

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا آڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

ساحر کی شاعری میں دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح انقلاب کی للکار اور حالات کو بدلنے کا عزم نظر آتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے منشور کے مطابق شاعری کو سیاسی جدوجہد کا راستہ بنانے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ فیض کی طرح موثر اور کامیاب نہیں تھے لیکن ان کا نقطہ نظر بھی وہی تھا جو کہ فیض کا تھا۔ انہوں نے بھی زندگی کے خوش گوار پہلوؤں سے ہٹ کر تلخیوں کی طرف زیادہ توجہ دی وہ کہتے ہیں۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب

ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

ساحر نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ انہوں نے انسانوں کے دکھ درد محسوس کیے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بڑی شدید کرب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر جب آزادی کے بعد فسادات ہوئے تو ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ وہ لوگ جنہوں نے آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔ اب آزادی ملنے کے بعد ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ اپنی نظم آج میں انہوں نے بڑی درد مندی سے لوگوں سے التجا کی ہے کہ وہ امن و امان کی فضا برقرار رکھیں اور ایسی صورت پیدا نہ کریں کہ آزاد ملک کے رہنے والے برباد ہو جائیں۔

مجموعی طور پر ساحرلدھیانوی ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک میں ہونے والی ناانصافی اور ظلم کے خلاف جدوجہد اور کوشش کی کہ لوگوں میں یہ شعور پیدا کریں کہ وہ ظلم اور جبر کو تسلیم کرنے سے انکار کردیں۔

فیض احمد فیض

فکری جائزہ:

قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری میں فیض احمد فیض کانام ترقی پسند شاعر ہونے کے حوالے سے بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے شاعری کا آغاز ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے کیا تھا لیکن 1930ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد فیض بھی نئے نظریات سے متاثر ہوئے اور اپنی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے منشور کے مطابق ڈھال دیا۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں اس تحریک کے سب سے نمایاں شاعر فیض ہیں۔

ترقی پسند تحریک روس میں پھیلنے والے اشتراکی نظام سے متاثر ہو کر شروع کی گئی تھی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شاعروں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی شاعری میں ذاتی مسائل، جذبات اور تکالیف کا ذکر کرنے کی بجائے معاشرے کے مظلوم لوگوں کے مسائل کی طرف دیکھیں اور جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافیوں کا شکار ہونے والے مجبور اور غریب لوگوں کی نمائندگی کریں۔ فیض نے یہ منشور اپنایا اور اپنی شہرہِ آفاق نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" میں واضح طور پر اس نظریے کا اظہار کہ وہ شاعر جو ماضی میں اپنے ایک خیالی محبوب کی جستجو میں سرگرداں رہتا تھا۔ اب معاشرے کے دکھوں کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا تصور ہے۔ فیض کہتے ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کر سوا

اس سے مراد یہی ہے کہ ادب برائے ادب کا تصور لاکھ دلکش سہی لیکن موجودہ دور میں ادب برائے زندگی زیادہ ضروری ہے۔ یعنی غم ِ جاناں کو اب غم دوراں مین ڈھل جانا چاہیئے۔ فیض نے یہی موضوع ایک اور جگہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

ترقی پسند تحریک ایک سیاسی تحریک تھی اور انقلاب کی دعوت اس تحریک کے منشور میں شامل تھی۔ فیض نے بھی اپنی شاعری میں لوگوں کو اکسایا کہ وہ اپنے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائیں انہوں نے کہا:

بول کے لب آزاد ہیں تیرے

بول زباں اب تک تیری ہے

تیرا ستواں جسم ہے ترا

بول کے جاں اب تک تیری ہے

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے

جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں

جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

اس طرح کی انقلابی شاعری کی پاداش میں فیض کو قید و بند کی مشکلات سے بھی گزرنا پڑا جس کے نتیجے میں انہوں نے مزاحمتی شاعری کے بڑے عمدہ نمونے پیش کیے۔ مثلاً ان کی نظم " نثار میں تیری گلیوں پے "اس دور کی نظم ہے جب وہ قید خانے میں تھے۔ انکی اس دور کی شاعری "زنداں نامہ "کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس دکھ کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے وطن سے دور رہنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ان کا عزم اتنا قوی تھا کہ اس دور میں بھی ان کی شاعری میں امید کی روشنی موجود ہے وہ کہتے ہیں

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے

یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں

گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا

یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں

علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

فیض کی یہ مزاحمتی شاعری درحقیقت ایک پیغام دیتی ہے کہ ظلم آخر کار ختم ہو جائے گا اور مجبور افراد ایک بار پھر کامیابی سے ہمکنار ہوں گے وہ کہتے ہیں:

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں

اِک ذرا صبر کے فریاد کے دن تھوڑے ہیں

فنی جائزہ:

فیض احمد فیض نے جہاں فکری سطح پر اردو شاعری کو ایک نئے دور سے آشنا کیا، وہاں ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شاعری کے علامتی نظام کے معنی تبدیل کر دیے۔ کلاسیکی شاعری میں استعمال ہونے والے تمام استعارے اور تشبیہات ان کے ہاں نئے معنی دیتے ہیں۔ مثلاً

چمن میں غاِب گل چین سے جائے کیا گزری

قفس سے آج صبابے قرار گزری ہے

اس شعر میں چمن، گل چن، قفس اور صبا کلاسیکی شاعری کے استعارے ہیں۔ ان سے مراد یہ تھی کہ جس طرح گل و بلبل کی محبت میں صیاد بلبل کو پنجرے میں قید کر دیتا ہے اور وہ پھول سے جدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی اپنے محبوب سے جدا محسوس کرتا تھا۔ لیکن فیض نے قفس کو قید خانے، چمن کو وطن، گل جبیں کو حکمران اور صبا ک قید خانے تک پہنچنے والی خبروں کے معنوں میں استعمال کیا۔ یہی وہ نکتہ ہے جو فنی سطح پر فیض کی شاعری کو منفرد بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ایسا فلسفیانہ لہجہ استعمال کیا جس میں شکوہ لفظی بھرپور انداز میں جھلکتا ہے۔ وہ انقلاب کے داعی تھے اور شاعری مین ان کا یہ انداز ان کے مقصد سے مطابقت رکھتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی

اٹھارویں صدی عیسوی میں نظیر اکبر آبادی کا نام اس حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے رحجانات سے ہٹ کر فکری اور فنی سطح پر اتنی مختلف شاعری کی کہ جو آج تک نقادوں کے لیے موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ فنی حوالے سے انہوں نے دو بنیادی تبدیلیاں کیں۔ اس دور میں غزل لکھی جاتی تھی اور نظم کا رواج بہت کم تھا۔ ان سے پہلے لوگ مثنوی لکھتے رہے تھے لیکن باقاعدہ نظم نہیں لکھی جاتی تھی نظیر نے نظم لکھنے کا آغاز کیا جدید دور کے مورخ ڈاکٹر جمیل جالبی ان کو جدید نظم کا پیش رو قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعری میں عوامی زبان استعمال کی اس دور میں شاعری کی

زبان کو طبقہ اشرافیہ کی زبان قرار دیا جاتا تھا۔ اس لیے شاعری میں مقامی زبان کے عوامی الفاظ غیر فصیح سمجھے جاتے تھے۔ نظیر نے اپنے دور کے عوام کی زبان میں نظم لکھی اور وہ نظم بہت مقبول ہوئی۔

فکری سطح پر نظیر کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے موضوعات تبدیل کر دیے۔ ان کی شاعری کے موضوعات اس دور کی تہذیب کا عکس پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے آگرہ میں زندگی گزاری تھی اور آگرہ کی تہذیب کو صرف دور سے دکھا ہی نہیں تھا بلکہ اس میں یہ بہ نفسِ نفیس شامل بھی ہوئے تھے۔ انہوں نے اس شہر کے سارے کھیل تماشوں اور عوامی مشغلوں میں شرکت کی تھی اور ان تمام سرگرمیوں کو اپنی نظموں کا حصہ بنا دیا تھا مثلاً ان کے موضوعات میں تیراکی پتنگ بازی، لکڑیاں کھیلنا، گلہری کا بچہ پالنا، کبوتر بازی، ریچھ کا بچہ اور اسی طرح کے عوامی مشاغل پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ انہوں نے اس معاشرے کو ہر رنگ اور ہر موسم میں دیکھا۔ سردی، گرمی، برسات، بارش ہر طرح کے موسم پر نظمیں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے دور میں ہر قسم کے تہواروں پر نظمیں لکھیں جن میں ہولی، دیوالی، بسنت، شبِ برات، عید اور اسی طرح کے تہوار شامل ہیں۔

نظیر نے موضوعات میں سب سے بڑا موضوع انسان ہے۔ انہوں نے انسان کو ہر روپ میں دیکھا ہے اور اسے اس کی دولت، اس کے مذہب اور اس کی حیثیت اور مرتبے سے بالاتر ہو کر صرف ایک انسان کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظم " آدمی نامہ " اس کی بہت بڑی مثال ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور

یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور

کل آدمی کا حسنِ قبح میں ہے یاں ظہور

شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و نور

اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر اکبر آبادی نے انسان کو صرف انسان کی حیثیت سے دیکھا، اسے نیکی کرنے کو کہا تاکہ دوسرے بھی اس کے ساتھ نیکی کریں۔ اسے قناعت کرنے کو کہا تاکہ وہ غربت میں بھی زندہ دلی سے جی سکے۔ نظیر نے اس انسان کو سکھایا کے دولت سب کچھ نہیں بلکہ دولت سے زیادہ اہم تندرستی اور اللہ کی رحمت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رہتا نہیں کسی کا صدا مال دھن درست
دولت رہی کسی کی نہ باغ و چمن درست

جتنے سخن ہے سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

نظیر کی شاعری میں انسان کا سچا اور خالص تصور سامنے آتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو اپنی تمام اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی تمام برائیوں سمیت نظیر کے سامنے ہے۔ انہوں نے اس انسان کو اس کی برائیوں کے ساتھ قبول کرلیا ہے اور اسے مسترد نہیں کیا یہ انسان جب غریب اور دکھی ہوتا ہے تو بھی ان کا محبوب ہے اور جب ناک تک پیٹ بھر کر اچھل کود کرتا ہے تو بھی نظیر اسے تسلیم کرلیتے ہیں۔ اس انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے جس کے حصول کے لیے یہ ہر بہروپ بھرتا ہے اور ہر انداز اختیار کرتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی نظمیں ان کی شاعری کے عوامی انداز کی دلالت کرتی ہیں۔ نظیر نے عوام میں رہ کر شاعری کی اور اپنی نظموں میں وہ حکمت ودانائی پیش کی کہ عوام میں مقبول ہوگئے۔ نظیر کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے واقعات سے ایسے فلسفیانہ نتائج اخز کرتے ہیں کہ انسان واقعی سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ نظیر اپنی نظموں میں حقیقی زندگیکی کتنی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں۔

نظیر کی مشہورِ زمانہ نظم "آدمی نامہ" نظیر کے عوامی انداز کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں انہوں نے انسان کا ایک ایسا تصور پیش کیاہے جو دولت اور غربت، نیکی اور بدی، بادشاہت اور فقر سب سے ماوراہے۔ نظیر نے انسان کو اس کے مذہب، مرتبے، رتبے، رنگ، نسل اور اسکی دولت سب سے جدا کرکے دیکھا ہے کہ وہ بحیثیت انسان کیسا ہے۔ اردو ادب میں اس نوعیت کی شاعری کی یہ پہلی مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ے چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال

اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال

یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال

سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے، میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے، سو ہے وہ آدمی

ان اشعار میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نظیر اپنی شاعری میں عام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایسے مسائل پیش کرتے ہیں جو ایک عام انسان کی زندگی کے حالات وواقعات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

نظم "روٹیاں" بھی نظیر کے عوامی انداز کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے اس نظم میں یہ بتایا ہے کہ انسان کس طرح روٹی کمانے کے لیے مختلف جتن کر تا رہتا ہے۔ نظیر نے روٹی کا موضوع اس لیے چنا کیونکہ روٹی ایک عام انسان کا بنیادی مسئلہ ہوتی نہیں اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ اگر روٹی نہ ہو تو زندگی کیسے گزرتی ہے۔ مزید براں نظیر کے نزدیک روٹی ہی وہ شے ہے جس کے ملنے یانہ ملنے پر نجابت اور شرافت کا تمام انحصار ہوتا ہے۔ اس کی خاطر انسان اپنے آپ ک دوسروں کا غلام اور نوکر تک بنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اب بدی نے کہیں اور نکوئی ہے

نہ دشمنی نہ دوستی، نہ تند خوئی ہے

کوئی کسی کا اور، کسی کا نہ کوئی ہے

سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے

نوکر، نفر، غلام، بناتی ہیں روٹیاں

مجموعی طور پر نظیر اکبر آبادی اپنے دور کے ایک منفرد شاعر تھے۔ انہوں نے فکری اور فنی حوالے سے اردو شاعری میں ایک انقلابی انداز اپنایا تھا اور آج بھی اپنے اس انقلابی انداز کی وجہ سے وہ آج بھی مقبول ہیں۔

6۔ گوہر مرزا کے ہاتھوں خرابی کے بعد امراؤ کو ایک صاحب راشد علی مرشد کے ہاتھ بیچا گیا اور یوں وہ باقاعدہ طوائف بن گئی۔

7۔ امراؤ کا پہلا مجرا نواب شجاعت علی خان کے صاحب زادے کی شادی میں ہوا۔ امراؤ نے غزل گائی اور بہت مقبول ہو گئی۔
اسی محفل میں نواب سلطان سے تعلق بنا۔

8۔ نواب سلطان سے تعلق محبت میں بدل گیا لیکن یہ محبت چل نہ سکی اور دونوں جدا ہو گئے۔

9۔ بسم اللہ اور مولوی صاحب کا واعہ۔ تور ب جعفر علی خان کی ملازمت

10۔ خورشید کا اغوا۔ میلے کا حل جس میں لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت نظر آتی ہے۔

حصّہ دوم

1۔ فیض علی کی اآمد، امراؤ سے عشق، بہت سارو پیہ دیناشہر میں چوریوں کی بڑھتی ہوئی وارداتیں

2۔ فیض علی کے ساتھ فرار، لڑائی اور گرفتاری، فیض علی اور فضل علی کانکل جانا۔ امراؤ کی گرفتاری۔ راجا کے سامنے پیشی، خورشید جان سے ملاقات اور رہائی

3۔ فیض علی سے دوبارہ ملاقات، کانپور آمد، فیض علی کی گرفتاری، مولوی صاحب سے ملاقات، گانے بجانے کا آغاز اور شہرت

4۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے بلاوا۔ بیگم سے ملاقات۔ بیگم صاحبہ دراصل رام دئی سے تھی۔ ڈاکوؤں کی آمد فضل علی کا امراؤ جان کا خیال کرنا۔ امراؤ کی گھر واپسی گوہر مرزا اور بوا حسینی کی آمد۔ لکھنؤ واپسی

6۔ امراؤ، بسم اللہ اور خورشید وغیرہ سیر کرنے گئے۔ وہاں امراؤ کو دلاور خان نظر آگیا ارپھ وہ پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا۔

امراؤ جان ادا

امراؤ کا اغوا اور لکھنؤ میں خانم کے کوٹھے پر فروخت۔ طوائف کی حیثیت سے تربیت۔ نواب سلطان سے ملاقات / جدائی، فیض بخش سے ملاقات اور فرار

2۔ کانپور آمد / گانا بجانا / بیگم سے ملاقات / واپسی

3۔ لکھنؤ واپسی۔ نوابوں کی ملازمت اور دربار تک رسائی

4۔ ۱۸۵۷ کا غدر۔ فیض آباد فرار / ماں سے ملاقات / لکھنؤ واپسی

5۔ نواب سلطان سے ملاقات / الگ رہنا / دلاور کی گرفتاری

حصّہ اول

1۔ فیض آباد سے امیرن کا اغوا ہونا دلاور اور پیر بخش نے اغوا کیا۔ لکھنؤ لائے کریم کے سسرال میں ٹھہرایا وہاں ایک اور لڑکی رام دیئی اس کے ساتھ کوٹھری میں بند تھی۔

2۔ امیرن کو خانم کے پاس بالاخانے پر بیچ دیا گیا۔ خانم نے اس کا نام امراؤ رکھ دیا۔

3۔ بوا حسینی اور مولوی صاحب نے امراؤ کو گود لے لیا اور پالا۔

4۔ امراؤ کے ساتھ بچپن میں بسم اللہ جان، امیر جان اور خورشید جان کے ساتھ گوہر مرزا بھی تھے۔ مولوی صاحب نے امراؤ جان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔

5۔ بسم اللہ جان کی مسی ہوئی، نواب چھبن بہت بڑے نواب تھے۔ انہوں نے بہت پیسہ خرچ کیا۔ کچھ عرصے یہ تعلق چلتا رہا۔ پھر نواب چھبن کے چچا نے انہیں عاق کر دیا۔ خانم نے بھی بے عزت کر کے نکال دیا۔ نواب نے ڈوبنے کی کوشش کی۔ لیکن اتفاق سے ولی عہد نے انہیں بچالیا۔ اور اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوشحال ہو گئے۔ لیکن بسم اللہ سے تعلق ختم کر دیا۔

حصّہ سوم

1۔ امراؤ جان ادا کی شاہی محل تک رسائی۔ سوز پڑھنے میں شہرت اور مرزا برجیس قدر کی تخت نشینی پر امراؤ مبارک باد دینے گئی۔ فسادات شروع ہو گئے اور اس کے بعد سب لوگوں کو بھاگنا پڑا۔ وہاں سے لونڈی تک بیگم صاحب کے ساتھ گئی اور وہاں سے فیض آباد چلی گئی۔

2۔ فیض آباد میں کچھ عرصے کے بعد، امراؤ مشہور ہو گئی۔ وہاں سے ایک آدمی کی زبانی اپنے باپ کی موت کا پتہ چلا۔ پھر ایک دن ایک جگہ مجرا کرنے گئی تو اسے ایسا لگا جیسے وہاں اس کا گھر ہو پھر اسے ایک عورت نے بلایا اور اندر لے گئی۔ وہاں اس کی ملاقات اپنی ماں سے ہوئی۔ اس سے مل کر واپس اپنے کوٹھے پر آئی تو دوسرے دن اس کے بھائی نے آکر اسے فیض آباد چھوڑنے کو کہا اور وہ واپس لکھنؤ چلی گئی۔

3۔ لکھنؤ میں نواب محمود سے مقدمہ بازی کے سلسلے میں اس کی ملاقات اکبر علی خان سے ہوئی۔ کچھ عرصہ وہ اکبر کے گھر بھی رہی جہاں ایک بڑھیا کی وجہ سے بڑی بدمزگی ہوئی۔

4۔ امراؤ کی ایک نوچی بھی تھی وہ بدکردار نکلی اور چلی گئی۔ اس کا نام آبادی تھا۔

5۔ امراؤ کی ملاقات نواب سلطان سے ہوئی۔ رام دئی نواب سلطان کی بیگم تھی۔

کردار نگاری۔ امراؤ جان ادا

امراؤ جان ادا کا کردار

اردو کے نثری ادب میں، امراؤجان ادا کا کردار غالباً سب سے زیادہ دلکش اور اہم کردار ہے۔ یہ کردار اپنی خوبصورتی، اپنی گائیکی، اپنے ذوق، شاعری، ذہانت اور حالات کی وجہ سے انتہائی پُرکشش ہے۔ مرزار سوانے ناول امراؤجان ادا میں لکھنؤ کی تہذیبی وراثت اس کردار کے آئینے میں دکھائی ہے۔ امراؤجان ادا ایک طوائف تھی اور انیسویں صدی میں طوائف، لکھنؤی تہذیب کا مرکز و محور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امراؤ کا کردار کثیر الجہت ہے۔ ایک طرف تو وہ ہمیں فیض آباد کی ایک اغواشدہ لڑکی امیرن کے روپ میں نظر آتی ہے جو اپنی آخری عمر میں بھی اپنی ماں اور اپنے بھائی کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہے اور دوسری طرف ہ شاہی دربار تک پہنچنے والی وہ سوز خواں ہے جس کی شاعری اور گلے کی دھوم پورے لکھنؤمیں ہے۔ اس کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ لکھنو کے طبقہ اشرافیہ کی تہذیبی سرگرمیوں میں شریک اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اکبر علی خان کے گھر مین بیھ کر وہ ہمیں اسی معاشرے کی گھریلو زندگی کی تصویر دکھاتی ہے۔

امراؤجان ادا فیض آباد سے اغوا ہوئی۔ خانم کے کوٹھے پر بکی، مولوی صاحب سے عربی اور فارسی میں کسبِ فیض کیا، شاعری کی تربیت لی، بڑے بڑے نوابوں اور اس دور کے جغادری لوگوں کی مصاحبت کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ لکھنو کے میلوں اور سیر گاہوں میں عوام الناس کے چہروں کا مطالعہ کیا اور آخر میں رنڈی کے پیشے سے توبہ کرلی۔ یہ کردار اس اعتبار سے ایک زمانہ شناس کردا ہے جو نہ صرف دوسرے انسانوں کی نفسیات سے واقف ہے بلکہ اپنی کمزواریوں اور خرابیوں سے بھی آگاہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امراؤجان ادا مرزار سوا کی وہ آنکھ ہے جس کی مدد سے اس نے لکھنو کے زوال پذیر معاشرے کا ہر منظر دیکھا۔ امراؤجان ادا ایک ایسا رشتہ ہے جس میں اس ناول کے تمام کردار پروئے ہوئے ہیں۔

امراؤجان ادا اپنے زمانے کی عام طوائفوں سے مختلف تھی۔ وہ اپنے پرستاروں کو فریب دینا او انہیں اپنے عشق کے دھوکے میں مبتلا کرنا جانتی تھی لیکن بسم اللہ جان کی طرح منہ پھٹ اور بدلحاظ نہیں تھی۔ کہ صرف اپنے مطلب کی خاطر دوستی رکھتی۔ وہ

نواب سلطان کے عشق میں گہری ڈوب گئی۔ لیکن اپنے آپ کو خورشید جان کی طرح تماشا نہیں بنایا۔ وہ خانم کا کوٹھا چھوڑ کر بار بار جاتی رہی لیکن مرتے دم تک خانم سے ناراض نہیں ہوئی۔

وہ ایک انتہائی متوازن شخصیت کی مالک تھی جس میں وضع داری بھی تھی اور مروت بھی۔ قسمت نے اسے بہت بڑا دھوکا دیا تھا۔ رام دئی کو بیگم صاحبہ کے روپ میں دیکھ کر اسے اپنی قسمت سے شکوہ بھی تھا اور اس پر مستقراد یہ کہ نواب سلطان جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا، رام دئی کا خاوند نکلا لیکن امراؤ نے اپنی وضع داری کو ایسا نبھایا کہ ان کے سامنے ایسا کوئی تاثر نہ دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ نواب کو جانتی بھی تھی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو امراؤ جان کا کردار قدیم لکھنو کے ان تہذیبی اور معاشرتی رویوں کا عکاس ہے جن کی وجہ سے آج بھی لکھنوی تہذیب پر کشش محسوس ہوتی ہے۔ جب ہم اس دور کے لکھنو کی تصویر امراؤ جان کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو درحقیقت ہم خود بھی اس تہذیب شائستگی، وضع داری اور مروت کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ جو امراؤ میں موجود تھی۔ مختلف شخصیات اور حالات وواقعات کے بارے میں امراؤ جان کے تبصرے درحقیقت ایک ایسے غیر جانب دار مبصر کی سوچ ہیں جو اس تہذیب کی خامیوں کے باوجود اس سے پیار کرتا ہے۔ نواب جعفر علی خان کا واقعہ اس کی بہت بڑی مثال ہے۔

خانم کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں خانم کا کردار لکھنؤ کی ایک ایسی نائکہ کا کردار ہے جو اپنے زمانے میں بہت مشہور ومعروف تھی۔ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات تھے اور معاشرے میں اچھا خاصا اثر ورسوخ تھا۔ لکھنو کے بازار حسن میں اس کا اپنا مکان تھا۔ جہاں بہت سے نوچیاں، طوائفیں، سازندے اور ملازم اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔

خانم کے ابتدائی تعارف میں بتایا گیا ہے کہ وہ تقریباً پچاس برس کی ایک شاندار بڑھیا تھی۔ سامنے کے بال سفید تھے۔ رنگ سانولا تھا اور اس کی شخصیت بہت بھاری بھر کم اور جامہ زیب تھی۔ بیٹھنے کا انداز شاہانہ تھا۔ پان دان، پیچوان، عمدہ زیور اور مہنگا لباس اس کی پہچان تھی۔ خانم کی شخصیت اتنی متاثر کن تھی کہ امراؤ اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ اس کی شخصیت سے مرعوب نظر آتی ہے۔

خانم اغواشدہ لڑکیاں خریدنے کا کاروبار کرتی تھی لیکن اپنے ضمیر ک مطمئن رکھنے کے لیے یہ دلیل دیتی تھی کہ یہ لڑکیاں دوسرے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی لڑکیوں سے بہتر زندگی گزارتی ہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ خانم اپنے کوٹھے پر تربیت پانے والی لڑکیوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ انہیں باقاعدہ تعلیم دلواتی تھی اور ایسا سلوک کرتی تھی کہ وہ اپنا ماضی بھول

جاتی تھیں۔ اپنے بارے میں امراؤنے یہی لکھا ہے کہ خانم کے کوٹھے پر اسے عیش کا وہ سامان میسر ہوا کہ وہ سب کچھ یہاں تک کہ چند ہی روز میں اپنے ماں باپ کو بھی بھول گئی۔

اپنی اس شفقت کے باوجود خانم اپنے پیشے میں بہت ماہر تھی۔ فنِ موسیقی میں بڑے بڑے استاد ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ امراؤ کو تربیت دینے والے استاد کو انھوں نے کئی بار اس بات پر ٹوکا کہ وہ غلط سُر لگوا رہے ہیں اور آخر کار استاد جی کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ غلط تھے۔ فنِ موسیقی میں مہارت رکھنے کے علاوہ خانم انتہائی چالاک اور ذہین عورت تھی۔ وہ لوگوں کی نفسیات سے واقف تھی اور اپنی نوچیوں کے لیے ان نوابوں سے زیادہ سے زیادہ رقم نکلوانے میں طاق تھی جب امراؤ کا پہلا مجرا ہوا تو خانم نے ایک بُہت مشہور گانے والی کے فوراً بعد اسے کھڑا کر دیا۔ لوگ حیران رہ گئے لیکن خانم کا تجربہ کام آیا اور امراؤ مشہور

ہو گئی۔

اس ناول میں خانم کا کردار اس لیے بھی اہم ہے کہ اسے دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں لکھنو میں ایک طوائف کتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ بڑے بڑے نواب زادے اس کے قدموں میں بیٹھتے تھے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بزرگ بھی انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے خانم کی منت کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ نواب چھبن کے واقعہ میں جب نواب چھبن کی والدہ خانم کے پاس تشریف لاتی ہیں اور ان سے گزارش کرتی ہیں کہ وہ نواب کو یہ احساس دلائیں کہ وہ بسم اللہ کا عشق چھوڑ کر اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کرلے تو خانم نے انہیں تسلی دی اور بڑی سہولت سے نواب کو ہمیشہ کے لیے اپنے کوٹھے سے رخصت کر دیا۔

خانم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر حالت میں اپنی نوچیوں سے محبت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ جب امراؤ کانپور اور فیض آباد سے ہو کر خانم سے الگ بھی ہو گئی تو بھی وہ اس سے محبت کرتی رہیں اور اس کا کمرا کبھی خالی نہیں کرایا۔ بقول امراؤ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے ساتھ سے جدا نہ سمجھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ خانم کا کوٹھا ان کی نوچیوں کے لیے ایک گھر کی طرح تھا۔ وہ دنیا جہان میں گھومنے پھرنے کے باوجود آخر کار خانم کے پاس واپس آتی تھیں۔

خانم کا کردار اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا انداز، حلیہ، اور میل ملاپ اس دور کی طوائفوں کے ادب و اداب کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ لکھنو میں طوائفیں کتنی صاحبِ حیثیت ہوا کرتی تھیں۔

1۔ مشہور و معروف نائکہ کا کردار

2۔ معاشرے میں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا

3۔ بازارِ حسن میں اپنا مکان تھا

4۔ خانم کی شخصیت

5۔ اغواشدہ لڑکیاں خریدنے کا کاروبار کرتی تھی۔

6۔ پیشے میں ماہر

7۔ چالاک اور ذہین

8۔ طوائف کتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی

9۔ نوچیوں سے محبت، ہر حالت میں

10۔ اپنی ذات میں انجمن کی حیثیت رکھتا ہے

بسم اللہ جان کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں بسم اللہ جان کا کردار ایک خالص طوائف کا کردار ہے جسے کسی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ خانم کی بیٹی تھی اور خانم کے زیرِ سایہ تربیت پا کر اس میں وہ ساری چالاکی، ہوشیاری اور بدلحاظی آچکی تھی۔ جو ایک طوائف کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ میلے کا منظر بیان کرتے ہوئے رسوا نے اس کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے "کھلتا ہوا سانولا رنگ، کتابی چہرہ، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ پتلی، چھریرا بدن، بوٹا سا قد" یہ تمام الفاظ بسم اللہ کی تصویر کھینچنے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اسے عشق بازی کا بڑا ملکہ تھا۔ امراؤ کے بقول انسان تو انسان، فرشتہ ان کے جال سے نہیں نکل سکتا تھا۔

بسم اللہ کی مسی نواب چھبن سے ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ ان کے ساتھ تعلق رہا اور پھر نواب کے چچا نے انہیں جائیداد سے بے دخل کر دیا۔ اور گھر سے نکال دیا۔ اب نواب چھبن کی صورتِ حال یہ تھی کہ ان کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا لیکن بسم اللہ نے اس صورتِ حال میں بھی نواب کا کوئی خیال نہ کیا اسے آخری دم تک یہی فکر رہی کہ وہ ان کے کپڑے ہتھیالے۔ اس موقع پر امراؤ نے بسم اللہ پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ہے " مگر واہ ری بسم اللہ رنڈی ہو تو ایسی "

بسم اللہ جان بہت خود پسند تھی اور اپنے عاشقوں کے ساتھ بڑا برا سلوک کرتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک اس کے عاشقوں کی کوئی عزت نہیں تھی۔ مولوی صاحب کے واقع میں بسم اللہ جان کی ستم ظریفی دیکھنے کے قابل ہے۔ وہ اس کی بندریا کولاٹھی کیاد کھا بیٹھے کہ اس نے درخت پر چڑھنے جیسی سخت سزا تجویز کر دی۔ یہاں تک کہ امراؤ اور میر صاحب نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی تب انہیں نیچے اترنے کی اجازت ملی۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مصنف نے بسم اللہ ک کلاسیکی شاعری کے محبوب کی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہو۔ وہ ستم کرتی تھی اور عاشق اسی ستم کے طلب گار ہوتے ہیں۔

بسم اللہ باذوق اور بذلہ سنج بھی تھی۔ خانم کے کوٹھے پر پرورش پا کر اس میں ادبی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس ذوق کی جھلک وہاں نظر آتی ہے جہاں مولوی صاحب اپنی آٹھ دن کی غیر حاضری کے بعد بسم اللہ کے پاس آئے اور اسے بتایا کہ وہ تپِ شدید میں مبتلا تھے تو بسم اللہ نے جواب میں کہا "تو یہ کہیے وصال ہو گیا ہوتا" اور اس کے بعد یہ غزل گانا شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی ؎

اسی کافر کی ادا یاد آئی

یہاں سے اس کے ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے

بسم اللہ خانم کی بیٹی تھی لیکن اس نے زندگی بھر خانم کو بہت دکھ دیے۔ یہاں تک کہ خانم کو اس کے ساتھ نفرت سی ہو گئی تھی۔ اکثر وہ خانم سے لڑ کر الگ ہو جاتی تھی اور اپنا اڈا بنا کر رہنا شروع کر دیتی تھی۔ لیکن پھر کسی نا کسی طرح ماں بیٹی میں صلاح ہو جاتی تھی۔

مجموعی طور پر یہ کردار ایک مکمل طوائف کا کردار ہے اگر دوسری طوائفوں سے اس کا موازنہ کیا جائے تو خورشید جان اس کے معکوس مزاج عورت تھی جبکہ امراؤ کے مزاج میں ایک توازن تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بسم اللہ کے مقابلے میں امراؤ میں بہت زیادہ انسانیت تھی اور وہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھتی تھی۔ بسم اللہ جان میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں تھی وہ اپنے چاہنے والوں سے مسلسل مطالبات کرتی رہتی تھی اور وقت آنے پر انہیں ایسے بھلا دیتی تھی جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

نواب سلطان کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں نواب سلطان لکھنو کے وایتی تہذیب یافتہ اور انتہائی سلجھے ہوئے نوابوں کا نمائندہ کردار ہے۔ اس کردار کی گفتگو کی شائستگی، لہجے کا ٹھہراؤ اور شعری ذوق بے مثال ہے۔ درحقیقت یہ وہ کردار ہے جس کے ساتھ امراؤ جان ادا ک قیقی عشق تھا گوہر مرزا امراؤ جان کی مجبوری تھا اور فیض بخش کے ساتھ اس کا دلی تعلق اس لیے تھا کہ وہ اس کو بہت مال

دولت دیتا تھا۔ لیکن نواب سلطان کے ساتھ امراؤ کا تعلق ایک ہم مزاج اور باذوق انسان کی حیثیت سے تھا۔ اسی وجہ سے امراؤ جان کے مردانہ کرداروں میں یہ کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

نواب سلطان کا تعارف اس وقت ہوتا ہے جب امراؤ اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے آغاز میں پہلا مجرا کرتی ہے۔ نواب سلطان اسے اس مجرے میں دیکھ کر خادم کے ہاتھ پیغام بجھواتے ہیں اور اس کی غزل منگواتے ہیں۔ یہ اس تعلق کی ابتدا تھی جس کی انتہا یہ ہوئی کہ رام دئی بیگم نواب سلطان کے روپ میں امراؤ کو ملی اور اس حقیقت کا ادراک کر کے امراؤ کو یہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ اس کی تقدیر بہت خراب تھی جس نے اسے طوائف کے کوٹھے پر پہنچادیا۔

نواب سلطان جب امراؤ سے ملے تو ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب تھی۔ وہ بہت کم سخن ار بھولے بھالے انسان تھے۔ صورت ایسی تھی کہ بقول امراؤ کیسی ہی سخت دل عورت کیوں نہ ہو، ان پر مائل ہو جاتی۔ ان کے بارے میں امراؤ نے یہ حملہ کیا کہ "خدا نے سر سے لے کر پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ ان کا ادبی ذوق ایسا عمدہ تھا کہ بات بات میں شعر پڑھتے تھے اور سخن فہم بھی تھے۔ امراؤ جان کے ساتھ ان کا ادبی ذوق خوب ملا ہوا تھا۔

نواب سلطان نجابت اور شرافت کا نمونہ تھے۔ یہ بات اس وقت زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی جب خان صاحب زبردستی ان کی خلوت میں گھس آئے ار بہت بدزبانی کی۔ نواب سلطان نے بہت ضبط کیا اور برداشت کی حد تک سہولت سے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی لیکن جب خان صاحب باز نہ آئے تو نواب نے طمنچہ داغ کر انھیں اس گستاخی کی سزا دی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نواب سلطان فطرتاً بہادر تھے۔

نواب سلطان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق چلنے کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنے ماں باپ کی پسند کے مطابق شادی کرنے سے انکار کر دیا اور رام دئی سے شادی کرلی۔ اس طرح اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا۔ البتہ ایک بات اس ناول میں واضح نہیں ہوسکی کہ نواب نے امراؤ جان کو کیوں چھوڑ دیا۔ امراؤ نے اس ضمن (سلسلہ) میں صرف اتنا کہا ہے "مگر افسوس فلکِ تفرقہ انداز نے وہ جسلہ بہت ہی جلد درہم برہم کر دیا۔"یعنی نواب کا ساتھ ان کی قسمت میں نہیں تھا۔

مجموعی طور پر یہ کردار اس ناول کے مردانہ کرداروں میں مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار درحقیقت امراؤ جان کی بدقسمتی اور حالات کے ہاتھوں اسے پہنچنے والے گہرے دکھ کی بنیاد ہے۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو مرزا رسوا نے یہ کردار بڑی خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے۔ اسے تہذیب اور شرافت کا نمونہ بنایا ہے اور ایک ایسی مثالی صورت دی ہے کہ حقیقتاً ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے امراؤ کے لیے نواب سلطان کا عشق سب کچھ تھا۔

فیض علی کا کردار

فیض علی یا میاں فیضو ناول "امراؤجان ادا" کا بہت اہم کردار ہے۔ یہ کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب نواب سلطان سے جدائی کے بعد امراؤجان خانم کے گھر زندگی گزار رہی تھی۔ خورشید جان میلے سے اٹھالی گئی تھی اور نواب چھبن کو خانم کے کوٹھے سے رخصت کیا جاچکا تھا۔ یہ کردار اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ امراؤ کو خانم کے کوٹھے سے نکال کر کانپور پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کردار کے تعارف کے ساتھ ہی ناول کا دوسرا حصّہ شروع ہوجاتا ہے گویا کہانی کو آگے بڑھانے میں یہ کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

فیض بنیادی طور پر ایک چور تھا جو لکھنو میں وارداتیں کرنے آیا تھا۔ اس نے امراؤ کو عیش باغ کے میلے میں دیکھا تھا۔ اور اس پر عاشق ہو کر چلا آیا تھا۔ اس کے پاس چوری کا بہت مال تھا جو وہ کھلے دل کے ساتھ امراؤ کو دیا کرتا تھا۔ ابتدائی ملاقاتوں میں ہی اس نے امراؤ کو اتنا مال دے دیا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ گر وہ ابتدا سے وہر مرزا کی طرف مائل نہ ہوتی تو ضرور فیض علی سے محبت کرتی۔ پیسے کے معاملے میں اس کا دل اتنا کھلا تھا کہ امراؤ نے ایسا دل چلا آدمی نہ رئیسوں میں دیکھا تا، نہ شہزادوں میں
۔

فیض علی اکثر کئی کئی دن غائب رہتا تھا۔ آخر کار اس نے امراؤ کو کچھ دنوں کے لیے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ امراؤ نے ابدا میں انکار کیا لیکن کچھ خانم سے جھگڑے کی وجہ سے اور کچھ روپے کے لالچ میں اس کے ساتھ نکل گئی۔ فیض علی نے اس کا بہت خیال رکھا۔ راستے مین ان پر گواروں نے حملہ کیا اس کا بھائی فضل علی بھی مل پڑا یہاں تک کہ راجہ کے سپاہیوں نے انھیں گھیر لیا۔ لڑائی کے دوران فیض علی امراؤ کی گاڑی کے آس پاس ہی رہا یعنی اس عالم میں بھی امراؤ کی محبت اس کے دل میں تھی۔

فیض علی حقیقت میں امراؤ کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ راجا کی قید سے رہائی ملتے ہی جب امراؤ اناؤ میں سلارو بھٹیارے کی سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی تو وہ وہاں پہنچ گیا اور امراؤ کو لے کر کانپور کی طرف چل پڑا لیکن کانپور پہنچتے ہی وہ گرفتار ہو گیا اور یوں امراؤ لکھنو سے کانپور پہنچ گئی۔ اس طرح ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کردار امراؤ کو کانپور پہنچانے ہی آیا تھا۔

فیض علی کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو لکھنو کی تہذیب کا ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جو اپنے دور میں جرم اور چوری ڈاکہ کرنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ طوائفوں اور گانے بجانے والیوں کے ساتھ مجرموں کا تعلق ہمیشہ سے رہا ہے۔ فیض علی بھی ایک ایسا ہی مجرم تھا۔ اس کی وضع شاہر کے بانکوں جیسے تھی۔ سانولے رنگ اور چھریرے بدن کا انسان تھا جسے زیادہ ادب و آداب

نہیں آتے تھے۔ ناول میں دیگر کرداروں کے مقابل میں یہ کردار زیادہ فعال محسوس ہوتا ہے اور کہانی میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

خورشید جان کا کردار

جب امراؤجان خانم کے کوٹھے پر بکی اور بوا حسینی نے اس کی تربیت شروع کی تو اس کی نوچیوں میں اس کی ایک ہم عمر لڑکی خورشید جان بھی تھی۔ وہ بیسوارے کی کسی زمین دار کی لڑکی تھی۔ امراؤ نے اس کے حسن و جمال کی بہت تعریف کی ہے۔ اسے پری کی صورت کیا ہے اور بڑی تفصیل سے اس کے خدوخال اور قد و قامت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بقول وہ جس محفل میں جا کے بیٹھ جاتی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی شمع روشن ہو گئی ہو۔

امراؤ کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خورشید جان ایک طوائف کی زندگی پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ خاندانی طور پر شریف عورت تھی اور رنڈی پنے کے لائق ہی نہیں تھی۔ اسے بسم اللہ جان کی طرح جھوٹا عشق جتانا اور لوگوں کو اپنی محبت کا اسیر بنا کر رکھنا آتا ہی نہیں تھا رنڈی پنے کے آغاز میں ہی وہ کسی پیارے صاحب نامی آدمی پر عاشق ہو گئی اور ان پر جان رہنے لگی۔ جس کی وجہ سے وہ خانم کی نظروں میں گر گئی۔

خورشید جان ایک عورت کے طور پر بھی بہت بے وقوف قسم کی عورت تھی۔ لوگ اسے بڑی آسانی سے دھوکا دے دیتے تھے۔ کئی پیروں فقیروں نے اسے دھوکے سے لوٹ لیا۔ اس کا مزاج اتنا اچھا تھا کہ اسے کبھی غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں امراؤ کا کہنا ہے کہ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں تو بہت بیٹیوں میں بھی کم ہوتی ہیں۔ پیارے صاحب سے عشق

ہونے کے بعد اس نے کسی سے دل نہ لگایا۔ یہاں تک کہ عیش باغ کے میلے میں راجا شیو دھیان سنگ کے آدمیوں نے اسے اٹھا لیا۔

لکھنو سے کانپور تک کے سفر کے دوران جب امراؤ گڑی میں خورشید جان سے ملی تو خورشید جان راجا کے ہاں بہت خوش تھی اور اس نے امراؤ کو بتایا کہ وہ زندگی اس کے مزاج کے مطابق تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خورشید جان ایسی عورت تھی ہی نہیں کہ جو خانم کے معیار پر پوری اترتی اسے تھوڑا بُہت ناچنا تو پھر بھی آتا تھا، لیکن گانے میں بہت اناڑی تھی امراؤ نے اس کے بارے میں بالکل درست کہا ہے کہ اگر وہ کسی قدر دان کی بیوی ہوتی تو ساری زندگی پاؤں دھو دھو کر پیتا۔

خورشید جان کا کردار در حقیقت بسم اللہ کی ضد ہے۔ اگر بسم اللہ طوائفوں کی دنیا کی ایک انتہا پر تھی تو خورشید جان دوسری انتہا تھی۔ وہ لکھنو کی تہذیب میں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب شریف گھرانوں کی لڑکیاں اغوا ہو کر خانم جیسی طوائفوں کے بالا خانوں پر پہنچتی تھیں تو ان پر کیا گزرتی تھی۔

1۔ ہم عمر لڑکی

2۔ حسن و جمال

3۔ طوائف کی زندگی پسند نہیں تھی

4۔ عورت کے طور پر بے وقوف تھی

5۔ مزاج بہت اچھا تھا

6۔ میلے سے اغوا ہوئی

7۔ نبئی زندگی مزاج کے مطابق تھی

8۔ بسم اللہ کی ضد ہے

گوہر مرزا کا کردار

گوہر مرزا خانم کے بالا خانے پر رہتا تھا۔ جب امراؤ وہاں گئی تو بسم اللہ اور خورشید جان کے ساتھ گوہر مرزا بھی مکتب میں پڑھتا تھا۔ وہ بنوڈومنی اور نواب سلطان علی خان کا بیٹا تھا۔ وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر بھی تھا۔ بوا حسینی نے گوہر مرزا کی شرارتوں پر مولوی صاحب کے ہاتھوں اس کی پٹائی دیکھی تو اسے اپنے ساتھ لے آئیں اور یوں وہ خانم کے بالا خانے کا حصّہ بن گیا۔ شکل و صورت اچھی تھی اور گانا بھی خوب تھا۔ اس لیے سب لوگوں میں مقبول تھا۔

امراؤ جان ادا کے بچپن سے لے کر آخری دم تک گوہر مرزا اس کے ساتھ رہتا تھا۔ امراؤ کا پہلا تعلق اسی کے ساتھ قائم ہوا۔ اور اس کے بعد ساری زندگی یہ تعلق قائم رہا۔ ایک موقع پر امراؤ نے یہ کہا ہے کہ ہر طوائف کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا شخص موجود ہو جو اس پیشے میں اس کی مدد کرے اور جب کوئی نہ ہو تو اس کے پاس رہے۔ ایسے شخص کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔ امراؤ کے لیے گوہر مرزا ایسا ہی انسان تھا۔

گوہر مرزا لکھنو کے ان کرداروں میں سے ایک ہے جن کا روزگار بالا سے وابستہ ہوتا تھا اور تمام زندگی وہ طوائفوں کے مرہونِ منت رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امراؤ جان گوہر مرزا کی چاہت کو وہ اہمیت نہیں دیتی تھی جو ایک عورت کی نفسیات کا حصہ ہوتی ہے۔ بقول اس کے مردانہ ہمت گوہر مرزا میں نہیں تھی اور اس کے خمیر میں ڈونی پنا موجود تھا۔ اسی لیے امراؤ کے ساتھ اس کی محبت در حقیقت امراؤ سے زیادہ اس کی اپنی ضرورت تھی۔

گوہر مرزا ایک ہنس مکھ انسان تھا جو ماحول میں خوش گوار اضافہ کرتا تھا۔ وہ صرف امراؤ سے ہی نہیں بلکہ بسم اللہ وغیرہ سے بھی بے تکلف تھا۔ مولوی صاحب کو ستانے کے لیے اس نے بسم اللہ کے ساتھ لگاوٹ کی باتیں کیں اور مولوی صاحب کو خوب جلایا۔ وہ انتظامی معاملات بھی سنبھالتا تھا میلے کی سیر کے لیے جاتے، تو وہاں فرش بچھوانے اور کھانے کا تمام انتظام کرنے کا ذمہ دار وہی ہوتا۔ کانپور سے امراؤ کو واپس لانے کے لیے بوا حسینی کے ساتھ گوہر مرزا ہی وہاں پہنچا۔

گوہر مرزا نے آخر میں شادی کر لی تھی۔ غدر کے زمانے سے پہلے امراؤ نے میاں فیضو سے بہت مال لیا تھا۔ وہ مال فیضو کے ساتھ بھاگنے سے پہلے وہ اپنی پڑوسن ک دے گئی تھی۔ غدر کے بعد اس بی بی نے وہ مال واپس کر دیا۔ لیکن گوہر مرزا وہ مال لے گیا۔ امراؤ نے اپنی وضع داری میں گوہر مرزا کا نام نہیں لیا۔ لیکن رسوا پہچان گئے کہ گوہر مرزا ہی وہ سب کچھ لے گیا تھا۔ اس نے امراؤ کے ساتھ تعلق ختم کر دیا تھا۔ وہ خود ہی کبھی ملنے آجاتی تھی تو ملاقات ہوتی تھی۔

مجموعی طور پر گوہر مرزا وہ کردار ہے جو ایک طوائف کی زندگی کی تکمیل کرتا ہے امراؤ کے ساتھ اس کا تعلق در حقیقت ایک ضرورت کا تعلق تھا۔ اسے امراؤ کی ضرورت تھی اور امراؤ کو اس کی اور یہی اس معاشرے کا المیہ تھا جہاں طوائف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

بوا حسینی کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں بوا حسینی وہ عورت ہے جس نے امراؤ جان ادا کی پرورش کی اراسے اپنی بیٹی کی طرح رکھا وہ خانم کی پاس رہتی تھی۔ کسی زمانے میں خود بھی اسی پیشہ سے وابستہ تھی۔ جب دلاور خان اور پیر بخش نے امراؤ کو خانم کے کوٹھے پر بیچا تو بوا حسینی نے اسے خانم سے مانگ لیا اور اپنے پاس لے گئی۔ امراؤ کے بقول وہ بڑی نیک ذات عورت تھی اور امراؤ پر بہت شفقت کرتی تھی۔

بوا حسینی کا مولوی صاحب کے ساتھ ایک تعلق تھا اور وہ انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بالاخانے پر یہی دستور تھا۔ بوا حسینی بھی مولوی صاحب کے ساتھ کسی زمانے کے تعلقات نباہ رہی تھی۔ اسے مولوی صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر گوہر مرزا کو لے آئی۔ اپنی خدمات کی وجہ سے وہ جانتی تھی کہ مولوی صاحب اعتراض نہیں کریں گے۔

بوا حسینی کی وجہ سے ہی مولوی صاحب امرؤ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور اسے تعلیم دینے میں بہت توجہ دیتے تھے۔

امراؤ سے بہت زیادہ محبت کے باوجود بوا حسینی خانم کی ہر بات مانتی تھیں۔ یوں تو امراؤ کے ساتھ جس کا تعلق بھی ہوتا، بوا حسین کی وساطت سے ہی ہوتا تھا۔ لیکن اگر امراؤ کی مرضی نہ بھی ہوتی تو خانم کے کہنے پر بوا حسینی اسے زبردستی آمادہ کرنے پر تیار رہتی تھی۔ جب امراؤ فیض علی کے ساتھ لکھنو سے فرار ہوئی تو اس کی دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بوا حسینی کے ساتھ اس کی ان بن ہو گئی تھی۔

بوا حسینی ایک جاہل عورت تھی اسے حساب کتاب نہیں آتا تھا۔ جب فیض بخش نے اسے پیسے دیے اور بتایا کہ پچھتر روپے ہیں تو اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ پچھتر کتنے ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی اس جہالت کے باوجود وہ امراؤ کی مزاج شناس تھی اور اس کی ذہنی کیفیت سمجھ جاتی تھی۔ جب امراؤ کانپور چلی گئی تو اسے وہاں سے بوا حسینی ہی واپس لائی۔ وہ ایک تجربہ کار عورت تھی اور جانتی تھی کہ نئی طوائفوں کو کس طرح اس پیشے کے لیے تیار کرنا ہے۔

بوا حسینی ایک بہت اچھی منتظم تھی۔ اسی لیے خانم اس پر بہت اعتماد کرتی تھی۔ گھر کا انتظام اس کے ہی ذمے تھا۔ مہمانوں کی خدمت، لڑکیوں کی نگہداشت اور گاہکوں کی فراہمی تک بوا حسینی کے فرائض میں شامل تھی وہ خانم کے ساتھ اس پیشے میں رہ کر بھی محبت اور شفقت کا نمونہ تھی اور اس کی موجودگی امراؤ کے لیے خانم کے کوٹھے پر ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ امراؤ نے جہاں بھی اس کا ذکر کیا ہے، اس کی شفقت اور مہربانی کے حوالے سے کیا ہے۔

مجموعی طور پر بوا حسینی کا کردار ایک ایسی مشفق اور مہربان عورت کا کردار ہے جس نے اپنی زندگی ایک ایسے پیشے میں گزاری جہاں لحاظ اور اعتماد نہیں لیا جاتا لیکن اس نے اس پیشے میں رہ کر بھی اپنے اندر کی انسانیت زندہ رکھی اور نئی آنے والی لڑکیوں پر شفقت کرتی رہی۔

نواب راشد علی خان

نواب راشد علی خان کا کردار اس آدمی کا کردار ہے جس کے ہاتھ پہلی بار امراؤجان کو فروخت کیا گیا۔ گوہر مرزا کے ساتھ تعلق استوار ہونے کے بعد خانم کے لیے بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ لیکن بقول امراؤ
"ایک آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا" ہدہد پھنس ہی گیا۔ یہ ہدہد راشد علی خان تھا۔ راشد علی کا تعلق ملک کے آئین سے تھا۔ ان کے والد وہاں کے صدر اسعد صد الصدور تھے اور اپنے بیٹے کے لیے ایک بُہت بڑا علاقہ اور روپے چھوڑ گئے تھے۔ وہ لکھنو علم حاصل کرنے کے لیے آئے تھے لیکن چند روز میں "علم تماش بینی میں طاق اور فن بیغیرتی میں مشاق" ہو گئے۔

راشد علی کا حلیہ عجیب وغریب تھا۔ جب گھر سے آئے تو چہرے پر ڈارھی تھی جو رفتہ رفتہ منڈا دی۔ سیاہ رنگ، چیچک کے داغ، بدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بال چپکے ہوئے تنگ پیشانی، چھوٹا گردن اور ٹھگنا سا قد تھا۔ لیکن اپے آپ کو بہت خوبصورت سمجھتے تھے۔ امراؤ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "ہمہ صفت موصوف تھے "یعنی کسی پہلو سے خوبصورت نہیں تھے۔ موچھیں اتنی مروڑی ہوئی تھیں کہ چوہیا کی دم ہو گئیں۔

راشد علی خان کی طبیعت میں بہت چھچھوراپن تھا۔ امراؤ کے ساتھ تعلق سے پہلے وہ اکثر اونچے اونچے کمروں پر جاتے تھے اور نوچیوں سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ بھی سمجھتے تھے کہ علم موسیقی میں ماہر ہیں۔ خود ہی شعر لکھتے تھے اور خود ہی گاتے تھے۔ اور تو اور منہ سے طبلہ بھی بجالیتے تھے۔ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ہاں کے شعروں پر بہت زیادہ داد دیتے تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ان کی تعاریف ہو رہی ہے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

امراؤ جان نے اس کردار کو خاص طور پر طنز اور مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اسے بے وقوف ثابت کرنا مقصود تھا۔ بہر حال یہ کردار لکھنو میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے والے ایسے نوجوانوں کا کردار ہے جو اس معاشرے میں آکر طوائفوں اور رنڈیوں کے چکڑ میں اپنی اصلیت فراموش کر دیتے تھے۔ اور لکھنو آنے کا مقصد بھول جاتے تھے۔ اس معاشرے میں جہاں بڑے بڑے نواب بالا خانوں کے اسیر تھے۔ وہاں باہر سے آنے والے ایسے کردار بھی موجود تھے۔

ناول میں اس کردار کی اہمیت یہ ہے کہ امراؤ کی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز اس کے ساتھ تعلق بننے سے ہوا۔ یہ کردار امراؤ کی اس زندگی کا پہلا کردار تھا۔ باالفاظِ دیگر پہلا گاہک تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امراؤ نے اس کا ذکر اتنی حقارت سے کیا ہے۔

اکبر علی خان

اکبر علی خان اس ناول کا بہت اہم کردار ہے۔ کیونکہ اس کردار کی وجہ سے امراؤ جان لکھنؤ کی عام زندگی سے واقف ہوئی۔ در حقیقت مصنف نے اس کردار کے ذریعے اس زمانے کے لکھنؤ کی گھریلو زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ جس زمانے میں امراؤ فیض آباد

سے واپس آئی تو اس پر نواب گور علی خان نے عدالت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ وہ ان کے نکاح میں ہے۔ اس مقدمے سے نجات حاصل کرنے میں اکبر علی خان نے امراؤ کی بہت مدد کی۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ "چلتے پرزے، آفت کے پرکالے، ناجائز کارروایوں میں مشاق، فعل سازی میں استاد، جھوٹے مقدمات بنانے میں وحیدِ عصر، عدالت کو دھکا دینے میں یکتائے زماں" تھے۔

اکبر علی خان بظاہر ایک برا آدمی تھا لیکن امراؤ کے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اس نے امراؤ سے پیسے بھی نہیں لیے اور امراؤ کو یقین تھا کہ اکبر علی خان کو اس کے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ اس زمانے میں امراؤ بھی اکبر علی کے ساتھ نماز کی پابند ہو گئی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد امراؤ اکبر علی کے ساتھ اس کے گھر بھی گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ نواب محمود عدالت سے ابتائی مقدمہ جیت گئے تھے اور امراؤ کو روپوش ہونا پڑا۔ اکبر علی کے گھر امراؤ بہت تنگ ہوئی لیکن اکبر علی نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ وہ قانون سے دلچسپی رکھنے والا انسان تھا۔ اس لیے اس کے دوست بھی قانون اور عدالت سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔

اکبر علی خان بظاہر بہ جھوٹا اور مکار انسان تھا اور اتنا چالاک تھا کہ نواب محمود علی خان جیسے بااثر انسان کو مقدمے میں شکست دے دی۔ لیکن اس کا ایک نظریہ یہ تھا کہ وہ رمضان اور محرّم مین اس قدر نیک کام کرتا تھا کہ اس کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ اس کے بارے میں امراؤ کو یہ کہنا تھا کہ اگرچہ وہ برا آدمی تھا، لیکن ایسا برا آدمی تھا جو کسی نہ کسی کے ساتھ اچھا ہوتا ہے۔ سو وہ امراؤ کے ساتھ اچھا تھا۔

اکبر علی خان ایک وضع دار انسان تھا۔ جب وہ مقدمے کے سلسلے میں امراؤ کے گھر اکثر آیا کرتا تھا تو بھی کھانا اپنے گھر سے منگواتا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہین تھا کہ امراؤ کے گھر سے کھانا کھانے سے انکار ہو۔ وہ لکھنو کی گھریلو معاشرت کا ایک کردار تھا۔ اور اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لکھنو کے عام انسانوں کی کیا کیفیت تھی۔ جب اکبر علی خان کی بیوی اور امراؤ کو ایک بڑھیا نے ذلیل کیا اور پھر بیگم صاحب اور امیرن نے آپس میں جلی کٹی باتیں کر کے امراؤ کا دل دکھایا اور اکبر علی خان کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ اپنی بیوی پر چیخے چلائے۔ یہاں تک کہ بڑے خان صاحب آئے تو وہ بھی اکبر علی خان کی بیوی پر خفا ہوئے۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں طوائفوں کا کسی کے گھر بیٹھ جانا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ بلکہ یہ روزمرہ کا معمول تھا۔

مجموعی طور پر یہ کردار اس ناول میں ایک ایسا پہلو پیش کرتا ہے جو اس کردار کے بغیر نامکمل رہ جاتا۔ خانم کے بالا خانہ لکھنو کی تہذیبی زندگی کا مرکز تھا۔ لیکن اس بالا خانے پر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا کہ گھریلو زندگی کا بھی جائزہ لیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کی مصنف نے یہ کردار متعارف کرایا۔

مرزا رسوا کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں مصنف مرزا رسوا کا کردار کئی اعتبارات سے بہت اہم کردار ہے۔ مختلف مقامات پر امراؤ جان ادا کی کہانی میں اس کردار کی مداخلت اور امراؤ کے ساتھ اس کے مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا رسوا سر سے پاؤں تک لکھنو کی تہذیب مین رچے ہوئے ایک انتہائی باذوق شاعر، ماہرِ نفسیات اپنے گردوپیش میں موجود طوائفوں اور نوابوں سے خوب اچھی طرح واقف اور ایک انتہائی ذہین انسان تھے۔

ناول کے آغاز میں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا رسوادرحقیقت اس کہانی کے راوی ہیں کیونکہ امراؤ جان کی کہانی بیان کرنے والے درحقیقت مرزا رسوا خود ہیں۔ وہ ہر قدم پر کہانی میں موجود رہتے ہیں اور اپنی سخن فہمی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر ہیں بلکہ اپنے زمانے کے ادبی مذاق پر بہت عمدہ تنقید بھی کرتے ہیں۔ امراؤ کی کہانی سے پہلے اس کا تعارف کرانے کے لیے، رسوا نے جس مشاعرے کی تفصیل بیان کی ہے، وہ بذاتِ خود لکھنو کے زمانے میں پائے جانے والے شعرا کی تصویر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے مظہر الحق نامی شاعر کی ایک طویل نظم پیش کی ہے۔ جس میں اپنے دور کے مشاعروں اور ان کی حرکتوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

امراؤ جان کی کہانی میں مرزا رسوا پہلی بار اس وقت مداخلت کرتے ہیں جب وہ ذکر کرتی ہیں کہ امیر جان گوہر مرزا کا گانا پسند کرتی تھی۔ اس موقع پر ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مرزا رسوا لکھنو کی رنڈیوں اور ان کے گرد وپیش سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ کہانی میں ان کی یہ مداخلت بہت مفید ثابت ہوتی ہے کیونکہ امراؤ کے ساتھ پیش آنے والے مکالموں میں وہ بنیادی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ امراؤ نے حقہ پینا کیوں شروع کیا، یا یہ کہ امراؤ کے پاس جتنا مال تھا، وہ کہاں گیا۔ اسی

طرح مرزا رسوا مختلف معاملات پر اپنے تبصرے بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً نواب چھبن کے ڈوبنے کے معاملے میں مرزا رسوا نے صاف کہہ دیا کہ ہر مچھلی نے انہیں یہ نقطہ سمجھایا تھا کہ جو شخص تیرنا جاناہ، وہ انے ارادے سے ڈوب نہیں سکتا۔ ناول کے آخر میں امراؤ کے خط سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ نواب چھبن ڈوبے نہیں۔

مرزا رسوا کا کردار ایک ماہرِ نفسیات کے طور پر بھی سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کی نفسیات کے بارے میں ان کا تجربہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے۔ اکبر علی خان کی بیوی کے گھر ہونے والے واقعات کے بعد وہ امراؤ کو بڑی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ گھریلو عورتیں اپنے مردوں کے معاملے میں اتنی حساس کیوں ہوتی ہیں اسی طرح پاک اور ناپاک محبت کے بارے میں ان کی رائے بڑی وقیع ہے۔ جب وہ امراؤ سے کہتے ہیں کہ اگر مولوی صاحب کو بسم اللہ سے پاک محبت تھی تو انہیں گوہر مرزا سے جلنا نہیں چاہئے تھا۔

مرزا رسوا کا کردار اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ وہ کہانی کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیتے اور اپنے مکالموں، بروقت جملوں اور مناسب تبصروں سے اس میں دلچسپی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس زمانے میں شاعری معاشرے میں بہت مقبول تھی۔ اسی لیے مرزا رسوا اس میں قدم قدم پر خوبصورت شعروں کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ ناول کی فضا کو لکھنو کی تہذیب کے ساتھ اس طرح وابستہ رکھتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک حقیقی کہانی ہماری نظروں کے سامنے ہو۔ اس اعتبار سے یہ کردار ناول کے دیگر کرداروں کی طرح کہانی میں شامل نہ ہونے کے باوجود اہمیت رکھتا ہے۔

مذہبی نظریات کے معاملے میں مرزا رسوا بہت روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہیں۔

"امراؤ جان ادا" کا تہذیبی پس منظر "

ناول امراؤ جان ادا لکھن کے اس دور کی کہانی ہے جب اس شہر کی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ میلے، سیر گاہیں، تعزیے، محرم کے جلوس اور سب سے بڑھ کر طوائفوں کے بالا خانے اس تہذیب کے مظاہر کا حصّہ تھے۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان کے کردار کے ذریعے یہ تمام تہذیبی مظاہر بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں اور ان کی تفصیلات اور جزئیات کا بہت خیال رکھا ہے۔ خاص طور پر خانم کے بالا خانہ ایک ایسا مقام بن کر سامنے آتا ہے جہاں سے پورا لکھنو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ خانم کے بالا خانے کے بارے مین امراؤ نے کہا تھا "یہ وہ مقام تھا جہاں سے ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملتا تھا ملا" حقیقت یہ ہے کہ یہی بالا خانے اس تہذیب کا مرکز تھے۔

خانم کے اس بالاخانے کا اندرونی ماحول اور یہاں پر آنے والے بیرونی لوگ سب ہی لکھنو کے کسی نہ کسی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نوچیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے والے استاد سے لے کر چالیس سال سے خانم کی خدمت میں حاضر رہنے والے خان صاحب تک اور نواب چھبن جیسے لوخیز رئیس زادے سے لے کر نواب جعفر علی خان جیسے ستر برس کے بوڑھے تماش بین تک ہر قسم کے کردار اس بالا خانے کی وساطت سے نظر آتے ہیں۔ یہ کردار لکھنو کی تہذیبی روایات سے پھوٹے ہیں اور اس معاشرے کی اجتماعی نفسیات کے غماز ہیں۔ مثلاً نواب جعفر علی خان کا کردار ہی دیکھیں تو عجیب احساس ہوتا ہے کہ اتنی بڑی عمر کا ایک نواب کس طرح ایک بچے کی مانن اپنی والدہ سے ڈرتا تھا اور رنڈی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے امراؤ نے کہا تھا کہ رنڈی رکھنا اس زمانے کا فیشن تھا اور کوئی امیر ایسا نہیں تھا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔

لکھنو کے نوابوں کے علاوہ علما کے کردار بھی اس ناول کا حصّہ ہیں اور ان کرداروں کو دیکھ کر بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس دور کا معاشرہ کس قدر زوال پذیر تھا۔ ان کرداروں میں پہلے مولوی صاحب وہ ہیں جو بوا حسینی کے ساتھ رہتے تھے "نورانی چہرہ، سفید کتراوں داڑھی، صافیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ عمدہ فروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاکِ پاک کی تسبیح۔

غرض کے جملے تبرکات" سے سجے ہوئے تھے یہ مولوی صاحب زیدپور کی طرف کے اچھے خاصے زمین دار تھے۔ بیوی بچوں والے تھے لیکن ایک طوائف کے کوٹھے پر بوا حسینی جیسی عورت کے ساتھ رہتے تھے۔ یہی اس دور کی تہذیب تھی۔ ایک اور مولوی صاحب جو "عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے اور ایسے ویسے مولوی نہ تھے "بسم اللہ جان پر ہزار جان سے عاشق تھے اتنے کہ اس کی تجویز کردہ سزا پر عمل کرنے کے لیے اس عمر میں درخت پر چڑھ گئے۔ یہ کردار موجودہ دور میں عجیب محسوس ہوتے ہیں لیکن اُس زمانے میں کلچر ہی ایسا تھا کہ طوائف کے بالاخانے پر جانا باعثِ عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

تہذیب کے ان فکری مظاہر کے ساتھ ساتھ اس ناول میں لکھنو کی اس دور کی تہذیب کے ظاہری پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ لباس، زیور، طرزِ رہائش، کھانا پینا غرضیکہ زندگی کا ہر پلو نظر آتا ہے۔ خاص طور پر اس میلے میں جہاں سے خورشید اغوا ہوئی تھی۔ امراؤ کا مشاہدہ اور لوگوں کا حلیہ اور بیان عروج پر نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر اس ناول میں لکھنو تہذیب کے ظاہری اور باطنی عناصر بہت واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا کو ایک عام کردار سے ہٹ کر ایک ایسی آنکھ بنا دیا ہے جس کی مدد سے قاری زمانے بھر کی سیر کرتا ہے۔

ناول "امراؤ جان ادا" کا نفسیاتی حوالے سے جائزہ:

"امراؤجان ادا" صرف ایک معاشرے کی ظاہری تصویر کشی ہی نہیں کرتابلکہ باطنی سطح پر اس معاشرے کے کرداروں کی نفسیاتی ساخت اور کیفیات کا مرقع بھی ہے ہے۔ بعض اوقات نفسیاتی کیفیات کا یہ بیان زمان و مکان سے آزاد ہو کر آفاقی انداز اختیار کرلیتا ہے۔

نفسیاتی تجزیے کا پہلا نمونہ وہاں ملتا ہے جہاں امراؤجان ادا طوائفوں کے درمیان رہتے ہوئے بڑی ہو رہی ہے اور ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس کے دل میں ایک خاص امنگ پیدا ہوتی تھی۔ خاص طور پر جب وہ لکھتی ہے کہ مجھے راز داری کی سمجھ بھی آگئی تھی اور یہ سمجھ بغیر سنِ تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ انسانی نفسیات کا یہ بیان قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ طوائفوں کا کسی ایک کو اپنا بنا کر رکھنا۔ مردوں اور بڑے بڑے نوابوں کا طوائفوں کی خوشامد کرنا غرض پورا ماحول انسانی نفسیات کی عجیب وغریب باتوں کا آئینہ دار تھا۔ اس پر یہ ہے کہ امراؤ ایسے ایسے باریک نفسیاتی نکتے بیان کتی ہے کہ مرزا رسوا کی نفسیاتی مہارت پر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً گوہر مرزا کی چاہت امراؤ کے لیے وہ نہیں تھی جو ایک عورت کی تمنا ہوتی ہے بلکہ وہ کوئی ناز برداری کرنے والا عاشق چاہتی تھی۔ اسی طرح عشق کے معاملات میں مولوی صاحب کا واقعہ بیان کرتے ہوئے رسوانے بڑی باریکیاں بیان کی ہیں مثلاً یہ کہ اگر مولوی صاحب کو بسم اللہ سے پاک محبت تھی تو ان کو گوہر مرزا سے جلنا نہیں چاہئے تھا۔

اپنی نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے تمام کردار الگ الگ نظر آتے ہیں۔ خورشید کا کردار بسم اللہ جان کے کردار سے بہت مختلف ہے۔ یہ کردار اس لیے مختلف ہے کہ اس کی پیدائش بالا خانے پر نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ بسم اللہ جان کی عشق بازی، بے دھڑک فرمائشوں اور بدلحاظی کے مقابلے میں خورشید جان کی نفسیاتی کیفیت مکمل طور پر ایک گھریلو عورت کی تصویر پیش کرتی ہے وہ کسی زمین دار کی بیٹی تھی اور بقول امراؤ "رنڈی پنے کے قابل نہیں تھی"۔

کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کا بڑا گہرا مشاہدہ وہاں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں امراؤجان عیش باغ کے میلے مین لوگوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی ہے۔ اس بھیڑ میں امراؤجان جس طرح لوگوں کی حرکتوں سے انکی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیتی ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ مثلاً ایک صاحب کا بچی کو چاندی کی چوڑیاں پہنا کر لانا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے رکھنا اسی طرح دو دوستوں کی بے تکلفی اور اندازِ گفتگو ان کی نفسیاتی کیفیات کا ترجمان ہے۔

مختلف کرداروں کے نفسیاتی تجزیے اور انسانوں کی عمومی نفسیات کا تفصیلی اظہار اس آخری خط میں ہوتا ہے جو امراؤنے مرزا رسوا کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں انسانی نفسیات کے حوالے سے بڑی گہری باتیں کی گئی ہیں۔ خاص طور پر عورتوں اور مردوں کی محبت، ایک طوائف کے ساتھ عورتوں کا تعلق اور یہ کہ عورتیں کس طرح محبت میں معاشی تحفظ تلاش کرتی ہیں اور مرد کس طرح سچے دل سے عشق کرتے ہیں۔ پھر حسن کا بیان کرتے ہوئے بڑا واضح طور پر کہا ہے کہ عورت کے نزدیک حسن و جمال کا

معیار صرف چہرے کی خوبصورتی نہیں بلکہ دیگر ایسی خصوصیات بھی ہیں جو عورت کو تحفظ دینے کا باعث بنی ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محبت کبھی بے غرض نہیں ہوتی۔

گھریلو اور بازاری عورتوں کے ضمن میں مرزا رسوا نے امراؤ کے اکبر علی خان کے گھر بیٹھ جانے کے بعد یہ تبصرہ کیا تھا کہ بازاری عورت کو ٹھکرانا اور اسے اپنے درمیان تسلیم نہ کرنا گھریلو عورت کا حق ہے۔ اس خط میں اسی بات کو دہراتے ہوئے امراؤ جان نے رنڈیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ "اس" بھلاوے میں نہ آنا کہ تمہیں سچے

دل سے چاہے گا۔ ان تمام نکات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امراؤ جان ادا انسانی نفسیات کے حوالے سے ایک بھرپور تحریر ہے۔

مولوی صاحبان کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں جہاں لکھنو کے مختلف دولت مند اور عیاش طبقوں کا ذکر ہے وہاں کچھ ایسے کردار ہیں جو اس دور کے مذہبی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مذہب سے وابستہ علماء کے بارے میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ طوائفوں کے بالا خانوں اور رقص و موسیقی کی محفلوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور طوائفوں کے ساتھ ربط وضبط بڑھانے سے گریز کرتے ہیں۔
لیکن "امراؤ جان ادا" کے علماء کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں لکھنو میں طوائف کا وجود اس حد تک تہذیب کا مرکز بن چکا تھا کہ علماء کے لیے بھی دامن بچانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

اس ناول میں علماء کے تین کردار بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا کردار بوا حسینی والے مولوی صاحب کا ہے جو زید پور کے رہنے والے تھے۔ جائیداد، بیوی بچے سب کچھ موجود تھا۔ لکھنو حصولِ علم کے لیے آئے تھے۔ یہاں بوا حسینی سے ملاقات ہوئی اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ وہ خانم کے بالاخانے پر اس کی نوچیوں کو تعلیم دیتے تھے اور زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزارتے تھے۔ خانم ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ امراؤ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بہت باذوق انسان تھے۔ نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی، صوفیانہ لباس، عمدہ انگوٹھیاں، تسبیح، سجدہ گاہ اور جریب (لاٹھی) غرضیکہ تمام تبرکات بہت عمدہ ہوتے تھے۔

دوسرے مولوی صاحب وہ ہیں جو بسم اللہ جان پر عاشق تھے۔ ان کے بارے میں امراؤ نے لکھا ہے کہ "وہ کوئی ایسے ویسے مولوی نہیں تھے۔ عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے"۔ ان مولوی صاحب کی عمر ستر برس کے قریب تھی۔ یہ مولوی صاحب بھی نورانی چہرے اور مخصوص صورت کے مالک تھے۔ یہ بسم اللہ جان پر ہزار جان سے عاشق تھے اور ایسے ویسے عاشق نہیں تھے بلکہ جب بسم اللہ نے سزا کے طور پر ان کو درخت پر چڑھنے کا حکم دیا تو اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اس عمر میں موت کا خطرہ مول لے کر درخت پر جا چڑھے۔ ان مولوی صاحب کے بارے میں امراؤ کا خیال تھا کہ انہیں پاک محبت ہے لیکن مرزا رسوا نے یہ نکتہ پیش کیا کہ اگر مولوی صاحب کو پاک محبت ہوتی تو گوہر مرزا کی بسم اللہ کے ساتھ شرارتوں سے ہرگز نہ جلتے۔

تیسرے مولوی صاحب وہ تھے جو امراؤ کو کانپور میں ملے۔ یہ عجیب وغریب قسم کے انسان تھے۔ بہت الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے۔ امراؤ فیض علی سے جدا ہونے کے بعد ان ہی مولوی صاحب سے ٹکرائی۔ ان مولوی صاحب کی شکل وصورت بھی عجیب تھی۔ چہرے سے بے وقوفی ٹپکتی تھی۔ ڈاڑھی بے تکے پن کی حد تک بڑھی ہوئی سر پر لمبے بال تھا۔ بات کرتے ہوئے جلدی سے منہ کھولتے اور پھر بند کر لیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے مسلسل کچھ کھا رہے ہوں۔ ان مولوی صاحب سے امراؤ کو بہت مدد ملی اور ان کی مدد سے اس نے کانپور میں زندگی کا آغاز کیا۔

ان مولوی صاحبان میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ تمام حضرات عالمِ دین ہونے کے باوجود بڑی آسانی سے طوائفوں کے چنگل میں پھنس جاتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے طوائف سے تعلق اس دور کی تہذیب کا لازمی حصّہ تھا۔ اس ناول میں یہ کردار قاری کی حیرت میں ڈال دیتے ہیں کہ مذہب اور اخلاق کے ساتھ یہ تمام سلسلے کیسے چلتے تھے۔

"امراؤ جان ادا" کے نواب

ناول "امراؤ جان ادا" میں جہاں طوائف کا بالاخانہ تہذیب کا مرکز تھا، وہیں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ یہ بالاخانے لکھنو کے نوابوں کے دم سے چلتے تھے۔ کسی نواب سے تعلق ایک طوائف کے لیے بڑی خوشحالی کا باعث بن جاتا تھا۔ اور دوسری طرف کسی طوائف سے تعلق ہونا نوابوں کے لیے معاشرے میں بڑی عزت افزائی کا باعث ہوتا تھا۔ اسی لیے نواب راشد علی خان جن کے ہاتھ امراؤ پہلی بار بکی اپنے دوستوں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ان کا بہت سی طوائفوں سے تعلق ہے، نائکاؤں کو اماں جان کہا کرتے تھے۔ یہ نواب اپنے دور کی تہذیبی روایت کے نمائندے ہیں اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں لکھنو کے طبقہ امرا کی کیا حالت تھی۔

اس ناول میں کچھ نواب ایسے ہیں ج کہانی کا حصّہ ہیں اور کچھ کہانی کے پس منظر میں موجود نظر آتے ہیں۔ نواب چھبن، نواب سلطان، نواب جعفر علی خان اور نواب محمود جیسے لوگ تو کہانی میں موجود ہیں لیکن نواب سلطان علی خان جن کا بنو ڈومنی سے تعلق تھا اور جو گوہر مرزا کے والد تھے کہانی کے پس منظر میں موجود ہیں۔ ان نوابوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنو کے طبقہ امرا میں یہ بات عام تھی کہ کسی طوائف سے تعلق رکھا جائے بلکہ نواب جعفر علی خان کا ذکر کرتے ہوئے امراؤ نے بہ واضح طور پر کہا ہے کہ رنڈی ملازم رکھنا اس زمانے کا فیشن تھا۔

ان نوابوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو طوائفوں کے ساتھ زیادہ راہ و رسم پسند نہیں کرتے تھے۔ مثلاً نواب چھبن کے چچا جن کی بیٹی کی نواب کے ساتھ منگنی ہوئی تھی، جب کربلا سے تشریف لائے تو انہوں نے نواب چھبن کو تمام جائیداد سے بے دخل کر دیا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ نواب چھبن نے ان کی بیٹی سے شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہو لیکن جو مکالمہ امراؤ کی موجودگی میں پیش آیا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نواب کے چچا بزرگوں کی نیک

کمائی حرام کاری میں ضائع نہیں ہونا دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا بھی تھا کہ "بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لیے نہیں ہے۔"

ان تمام نوابوں میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ بہت کم عمری میں طوائفوں سے تعلق وابستہ کر لیتے تھے۔ جیسے نواب چھبن کے بارمیں امراؤ نے لکھا ہے کہ خانم نے جانے کن ترکیبوں سے کمپا مارا کہ پچیس ہزار روپے بسم اللہ کی مسی پر خرچ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی طرح نواب سلطان کا تعلق امراؤ سے ہوا تو ان کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طوائفوں کے ساتھ تعلق ایک عام رواج ہونے کے باوجود بہر حال نوجوانوں کا مشغلہ تھا۔ جس میں بڑی عمر کے لوگ بہت کم حصّہ لیتے تھے۔ البتہ نواب محمود جیسے لوگ بھی موجود تھے جو رنڈیوں کو صرف اپنا ملازم بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔

اس ناول کے یہ تمام نواب اپنے دور کی تصویر کشی کرتے ہیں اور ان کے ریوؤں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب کسی معاشرے کا رئیس طبقہ اپنی دولت عیش و عشرت پر لٹانا شروع کر دے تو معاشرے کی مجموعی فضا اور لوگوں کی اخلاقی کیفیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

س: حسنو میاں کیسے انسان تھے؟

ج: میاں حسنو نواب چھبن کے انتہائی "وفادار" اور قریبی دوست اور کارکن تھے۔ یہ صاحب اکثر اوقات خانم کے کوٹھے پر نواب چھبن سے چوری چھپے تشریف لاتے۔ یوں تو یہ نواب چھبن پر جان دیتے تھے اور ان کی خاطر کچھ بھی کرنے کو ہر دم تیار رہتے تھے لیکن نواب چھبن کے اپنے چچا کی جائیداد سے دست بردار ہونے کے بعد، میاں حسنو کے رویے میں بڑی تبدیلی پیش آئی۔ انہوں نے اس کٹھن وقت میں نواب چھبن کا ساتھ دینے کی بجائے، الٹا ان ہی کی معشوقہ یعنی کے بسم اللہ جان ک نوکری کے غرض سے تاکنا شروع کر دیا۔ اور بھرپور کوشش کی کہ وہ ان کے چنگل میں پھنس جائے لیکن بسم اللہ نے بڑی آسانی سے میاں حسنو کو بے عزت کر کے چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

میاں حسن طلب پرست ہونے کے باوجود انتہائی بے وقوف تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو چار ہزار روپے کی رقم ان کی مرحوم والدہ ان کے لیے چھوڑ گئی تھیں، وہ ان کی بیوی با آسانی اپنے یار کے ساتھ لے کر بھاگ گئیں۔

یہ کردار لکھنو کے زمانے کی بدلحاظی اور بے مروتی کا نمائندہ کردار ہے۔

نواب جعفر علی خان کا کردار

نواب جعفر علی خان وہ ستر سالہ نواب تھے جن کے ہاں امراؤ ملازم ہوئی۔ ان کا تعارف کرتے ہوئے امراؤ نے کہا "منہ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہوگئی تھی، سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا، مگر اب تک اپنے آپ کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے"۔ امراؤ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ واقعی پیار کرنے کے قابل تھے۔ اتنی بڑی عمر ہونے کے باوجود وہ اپنی اماں سے اس طرح ڈرتے تھے جیسے پانچ سال کا بچہ ڈرتا ہوا۔ ایک کھلائی ان کی خدمت میں ہر وقت موجود ہوتی جو ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ نواب جعفر اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی شادی بچپن میں ہوئی تھی لیکن تمام زندگی وہ ان سے جدا نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھے سوز خواں تھے۔ فنِ موسیقی میں انہیں کمال حاصل تھا اور ان کے آگے بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے۔ امراؤ کو ان کی ملازمت سے یہ فائدہ ہوا کہ اسے بے شمار سوز یاد ہوگئے اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

مجموعی طور پر نواب جعفر علی خاں لکھنوی تہذیب کے ان لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے گھر والوں کے باوجود رنڈی کے ساتھ تعلق رکھنے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔

نواب جعفر کا کردار درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس دور میں لکھنو میں رنڈی رکھنا اس زمانے کا فیشن تھا اور ہر ایسا کوئی رئیس نہ تھا جس نے رنڈی نہ رکھی ہو۔

فضل علی کا کردار

ناول "امراؤ جان ادا" میں فضل علی فیض علی کا بھائی تھا۔ اس کا تعارف اس وقت ہوتا ہے جب امراؤ جان ادا لکھنو سے نکل کر لال گنج کی سرائے میں پہنچتی ہے اور وہاں سے نکل کر وہ لوگ ایک ویران جگہ رکے جہاں فیض علی جا کر فضل علی کو ساتھ لے آیا۔ فضل علی فیض علی کی طرح ڈاکو تھا اپنے بھائی سے محبت کرتا تھا۔ جب راجا کے سپاہیوں نے حملہ کیا تو فضل علی اور فیض علی دونوں بھاگ نکلے۔

اس واقعہ کے بعد فضل علی اس وقت سامنے آیا جب امراؤ بیگم کے پاس گئی۔ شہر سے دور اس بڑی سی کوٹھی میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ سب عورتیں ڈر گئیں اور بیگم صاحبہ تو بے ہوش ہو گئیں۔ ان ڈاکوؤں کا سردار فضل علی تھا۔ جب فضل علی کو معلوم ہوا کہ امراؤ یہاں بیٹھی ہے تو اس نے اس جگہ ڈاکہ ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فضل علی میں بہت زیادہ انسانیت تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ دیا کہ وہ اپنے بھائی کی آشنا کا سامان نہیں لوٹے گا۔

فضل علی کا کردار اپنے دور کے ان وضع دار لوگوں کا کردار ہے جو برے ہونے کے باوجود اپنی اچھی روایات پر قائم رہتے ہیں۔ فضل علی ایک ڈاکو تھا لیکن اس میں غیرت موجود تھی۔ یہ کردار امراؤ کے مردانہ کرداروں میں ایک منفرد کردار ہے۔

ڈرامہ

1۔ پلاٹ: واقعات کی ترتیب

2۔ کردار: حقیقی

3۔ مکالمہ:

4۔زبان: مسجّع مقفّع

5۔ منظر نگاری

س: امراؤ جان اور بسم اللہ کے کرداروں کے درمیان بنیادی فرق کی وضاحت کیجئے۔

ج: امراؤ جان اور بسم اللہ ناول "امراؤ جان ادا" کے مرکزی کردار ہیں۔ بے شک دونوں امراؤاور بسم اللہ ایک ہی پیشے سے تعلق رکھتی تھیں اور ایک ہی کوٹھے پر قیام پذیر تھیں۔ ان کے کردار کے بہت سے پہلو ایک دوسرے سے مخالفت کرتے ہیں۔ بسم اللہ ذات کی رنڈی تھی جس نے خانم کے کوٹھے پر ہی پرورش پائی اور یوں ایک خالص طوائف بنی جسے کسی سے کوئی ہمدردی نہ تھی جبکہ امراؤ فیض آباد سے اغوا ہوئی اور خام کے کوٹھے پر بیچ دی گئی الغرض حالات کی ستم ظریفی نے اسے اسے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھنے والی امیرن سے مشہور طوائف امراؤ جان بنا دیا۔

چونکہ امراؤ اغوا ہر کر خانم کے کوٹھے پر آئی تھی، اس نے اپنی زندگی کے نو دس برس اپنے ماں باپ کے سائے میں گزارے تھے جنھوں نے اسے دین و دنیا کی تعلیم دی۔ لہذا ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھنے کی بدولت امراؤ میں ہمدردی اور انسانیت جیسی خصوصیات دیکھنے ک ملتی تھیں۔ وہ دوسروں کے جذبات کا خاص خیال رکھتی تھی اور کسی کو دکھ نہیں پہنچاتی تھی دوسری

جانب بسم اللہ کسی سے ہمدردی کرنا تو دور کی بات، کسی سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ انتہائی منہ پھٹ اور بدلحاظ تھی۔ اس کے نزدیک اس کے چاہنے والوں کی کوئی زت نہ تھی اور وہ اپنے عاشقوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی تھی۔ خاص طور پر مولوی صاحب کے واقعہ میں بسم اللہ کی ستم ظریفی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مولوی صاحب جو اس پر جان نچھاور کرتے تھے غلطی سے اس کی بندریا کو لاٹھی دکھا بیٹھے۔ بسم اللہ نے ان کے لیے درخت پر چڑھنے جیسی سخت سزا تجویز کردی اور امراؤ ار میر صاحب کے کہنے پر ان ک نیچے اترنے کی اجازت دی۔ یہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مرزا رسوا نے بسم اللہ کے کردار کو کلاسیکی اردو شاعری کے محبوب کی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے عاشق اس کے ستم کے طلب گار رہتے تھے۔

امراؤ نے اپنے پیشے کے آغاز میں نواب سلطان سے ملاقات کی اور جلد ہی ان کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ دونوں کا رشتہ ایک دوسرے سے حقیقی محبت کا تھا اور چونکہ دونوں ہم مزاج تھے اور ادبی ذوق بھی ملا ہوا تھا، ایک دوسرے سے خاصے مطمئن نظر آتے تھے۔ اس کے برعکس بسم اللہ نے نواب چھبن سے اپنا تعلق محض دولت کی خاطر برقرار رکھا۔ جب نواب چھبن کے چچا نے انہیں اپنی جائیداد سے بے دخل کر دیا تو بسم اللہ کے بجائے ان کو تسلی دینے کے یہ کوشش کی کہ کسی طرح وہ ان کے کڑے ہتھیالے اس موقع پر امراؤ نے خود کہا "واہ ری بسم اللہ رنڈی ہو تو ایسی "یعنی کہ بسم اللہ اپنے عاشقوں کو صرف تب تک برداشت کرتی تھی جب تک ان کے پاس مال و دولت ہوتی۔

امراؤ کا ادبی و شعری شوق بسم اللہ سے کئی گنا زیادہ تھا۔ وہ ایک مشہور شاعرہ اور سوز خوان تھی جس نے شاہی دربار تک رسائی حاصل کی اور جس کے گلے اور شاعری کی دھوم پورے لکھنو میں تھی بے شک بسم اللہ ک بھی غزل گوئی پر کمال حاصل تھا، اس نے امراؤ جتنی شہرت نہ پائی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ خانم کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس کو عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا اور شہرت بھی حاصل تھی۔

لہذا اس میں خود کا نام پیدا کرنے کی کوئی تمنا نہ تھی۔

بسم اللہ بہت منہ پھٹ اور بدلحاظ تھی۔ بے شک وہ خانم کی بیٹی تھی، اس نے اپنی ماں کو زندگی بھر بہت دکھ دیے۔ جتنی کہ خانم جو کہ ہرگز اپنی نوچیوں ک اپنے سے جدا نہیں سمجھتی تھی۔ بسم اللہ سے نفرت سی کرنے لگی۔ اکثر بسم اللہ خانم کا کوٹھا چھوڑ کر اپنا اڈا بنا کر رہنا شروع کر دیتی لیکن پھر ماں بیٹی میں صلاح ہو جاتی اور وہ واپس لوٹ آتی۔ امراؤ نے کبھی خانم سے ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ وہ خانم کا کوٹھا چھوڑ کا جاتی رہی لیکن کبھی اس سے ناراض نہ ہوئی۔

مجموعی طور پر بسم اللہ کا کردار ایک خالص رنڈی کا کردار ہے جس میں خانم کے زیرِ سایہ تربیت پا کر وہ ساری چالا کی، ہوشیاری اور بد لحاظی آچکی تھی جو ایک طوائف کے لیے لازمی ہوتی ہے جبکہ امراؤ کے کردار میں ایک توازن نظر آتا ہے وہ اپنے پرستاروں کو فریب دینا اور جھوٹے عشق میں قید کرنا جانتی تھی لیکن چونکہ اس میں انسانیت اور انسانی جذبات کی قدر کرنے کی خوبی موجود تھی، وہ اپنے چاہنے والوں اور اپنی زندگی میں موجود تمام لوگوں کا خیال کرتی تھی۔

س: " امراؤ جان ادا" میں رسوا نے اپنے سماج کی تہذیب کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے "۔ بحث کریں۔

ج: ناول " امراؤ جان ادا " مرزا رسوا کا شاہکار ہے جس میں انہوں نے نہ صرف لکھنو کے اس دور کے ایک افسوس ناک امر کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ اس دور کی لکھنوی تہذیب کی بہترین اور مکمل عکاسی کی ہے۔ " امراؤ جان ادا " اس دور کی کہانی ہے جب لکھنوی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ میلے سیر گاہیں تعزیے، محرم کے جلوس اور سب سے بڑھ کر خانم کا بالاخانہ اس تہذیب کے چند مظاہر ہیں جن کو مرزا رسوا نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا۔ اپنے بیان میں انہوں نے تفصیلات اور جزئیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ خاص طور پر خانم کا کوٹھا ایک ایسا مقام بن کر سامنے آتا ہے جس میں لکھنوی تہذیب کی مکمل تصویر دکھائی دیتی ہے خانم کے کوٹھے کے بارے میں امراؤ نے کہا " یہ وہ مقام تھا جہاں ذلت، عزت، بدنامی، نیکنامی، زرد روئی، سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملنا تھا، ملا " حقیقت میں بھی خانم کے بالا خانے جیسے بالا خانے لکھنوی تہذیب کا مرکز و محور تھے۔

خانم کے کوٹھے کا اندرونی ماحول اور اس میں آنے والے بیرونی لوگ سب لکھنو کی تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً نواب سلطان لکھنو کے روایتی تہذیب یافتہ اور سلجھے ہوئے نوابوں کی تصویر پیش کرتے ہیں جبکہ گوہر مرزا ایسے افراد کی نمائندگی کرتا ہے جن کی روزگار کوٹھے سے وابستہ تھی اور یہ طوائفوں کے مرہون منت رہتے تھے۔ نوچیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے

والے ملک صاحب سے لے کر چالیس بس سے خانم کی خدمت میں رہنے والے خان صاحب تک اور نواب چھبن جیسے رئیس نوخیز نواب سے لے کر نواب جعفر علی جیسے بوڑھے تماش بین تک سب کردار لکھنو کے اس دور میں موودو افراد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار روایتی تہذیب سے پھوٹے ہیں اور اس معاشرے کی اجتماعی نفسیات کے غماز ہیں مثلاً نواب جعفر کے کردار کو دیکھ کر حیرانگی کا احساس ہوتا ہے کہ کس طرح اتنا بوڑھا شخص ایک بچے کی مانند اپنی ماں سے ڈرتا تھا اور گھر میں ایک رنڈی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے امراؤ نے کہا ہے کہ رنڈی رکھنا اس دور کے امیر لوگوں کا دستور تھا اور شاید ہی کوئی ایسا امیر ہو جس نے رنڈی نہ رکھی ہو اسی طرح بوا حسینی کا کردار، خورشید کا کردار، بسم اللہ کا اور خانم کا کردار سب لکھنو کے اس دور کے ایک مخصوص قسم کے افراد کی نمائندگی کرتے ہیں۔

لکھنو کے نوابوں، رئیسوں اور رنڈیوں کے علاوہ اس دور کے علما لکھنوی تہذیب کا ایک اہم حصّہ تھے۔ ان کے کرداروں سے بڑی شدت سے مایوسی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ یہی کردار لکھنو میں زوال کا اعث بنے۔ مثلاً وہ مولوی صاحب جو بوا حسینی کے ساتھ دیتے تھے جن کے بارے میں امراؤ نے کہا "نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی، صوفیانہ لباس، ہاتھ میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں خاک الغرض جملہ تبرکات سے سجے ہوئے تھے" زید پور کے اچھے خاصے بال بچوں والے زمین دار تھے لیکن اپنا گھر بار چھوڑ کر خانم کے کوٹھے پر بوا حسینی جیسی عورت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اسی طرح ایک اور مولوی صاحب جو "عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے اور ایسے ویسے مولوی نہ تھے" بسم اللہ پر ہزار جان سے عاشق تھے۔ یہاں تک کہ اس کی تجویز کردہ سزا کے طور پر اس عمر میں بھی درخت پر چڑھ گئے۔ یہ ایسے کردار ہیں جو آج کل کے دور میں بڑے عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں لیکن اس دور میں ایسے کرداروں کا ہونا ایک عام بات تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رنڈی کے کوٹھے پر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ تہذیب کا حصّہ تھا اور یہی اس دور کا المیہ تھا۔

فکری مظاہر کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب کے ظاہری پہلوؤں کو بھی اس ناول میں اجاگر کیا گیا ہے۔ مہنگے کپڑے، عمدہ لباس، بہترین زیور، طرح طرح کے کھانے، طرزِ رہائش غرضیکہ زندگی کا ہر پہلو اس کا حصہ ہے۔ خاص طور پر عیش باغ کے میلے کا منظر بیان کرتے ہوئے رسوا نے امراؤ کے ذریعے اس دور کے لوگوں کی نفسیات اور چہروں کا گہر مطالعہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول انیسویں صدی کے لکھنو کے ظاہری اور باطنی عناصر کی عکاسی کرتا ہے۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان کو محض ایک کردار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسی آنکھ بنا کر پیش کیا ہے کہ لکھنو کے اس دور کی تصویر قاری کے سامنے پیش ہو جاتی ہے۔

س: ناول "امراؤ جان ادا" میں لکھنوی تہذیب کے صرف منفی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے؟ آپ کس حد تک اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟

ج: ناول "امراؤ جان ادا" لکھنوی تہذیب اور روایات کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ یہ اس دور کی کہانی ہے جب لکھنوی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ میلے، سیر گاہیں، تعزیے، محرم کے جلوس اور خصوصاً خانم جیسی نائکاؤں کے بالاخانے اس تہذیب کا مرکز تھے مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا کے کردار کے ذریعے لکھنو کے اس دور کی تہذیب کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے امراؤ جان وہ آنکھ ہے جس کے ذریعے رسوا ہمیں لکھنو کے اس دور کا ہر منظر دکھاتے ہیں۔

خانم کا کوٹھا لکھنوی تہذیب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ انیسویں صدی میں طوائف لکھنو تہذیب کا مرکز و محور تھی۔ خانم کے ک کوٹھے کے بارے میں امراؤ نے لکھا ہے کہ "یہ وہ مقام تھا جہاں ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی جو

کچھ دنیا میں ملتا تھا، ملا" درحقیقت خانم جیسی طوائفوں کا کوٹھا اس دور کی تہذیب کی تصویر کشی کرتا ہے۔ مرزا رسوا نے اس ناول کے ذریعے لکھنوی تہذیب کے اس افسوس ناک منفی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے نتیجے میں لکھنو کا معاشرہ ایک زوال پذیر معاشرہ بنتا جارہا ہے۔ طوائف اس دور میں اتنی اہمیت اختیار کرچکی تھی کہ ہر بڑا رئیس اور نواب اس کے ساتھ تعلق کو اپنی عزت افزائی کے لیے لازمی سمجھتا تھا یہاں تک کہ نواب راشد علی خان، جن کے ہاتھوں امراؤ پہلی بار بکی تھی، دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ان کا تعلق بہت سی طوائفوں کے ساتھ رہا ہے، نائکاؤں کو اماں جان کہا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے رئیس زادے کتنی گھٹیا سوچ کے مالک تھے۔ نواب چھبن، نواب سلطان اور نواب جعفر علی خان اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ ایک طوائف کے ساتھ تعلق لکھنوی تہذیب میں جیسے لازمی ہوگیا ہے۔ طوائف اس حد تک تہذیب کا مرکز بن چکی تھی کہ بڑے بڑے علماء اور مولوی صاحبان بھی اس کے چنگل سے بچ نہیں پائے۔

اس کے علاوہ فیض علی اور فضل علی جیسے ڈاکو اس تہذیب کا ایک اہم حصّہ تھے۔ یہ لکھنو جیسی جگہوں سے میں وارداتیں کر کے اتنی دولت کما لیتے تھے کہ اونچی اونچی طوائفوں کے تعلق بن جاتا تھا۔ مثلاً فیض علی نے ڈاکوں سے کمائی ہوئی۔ دولت امراؤ پر خوب لٹائی اور اسے اتنا مال دیا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر ابتدا سے ہی وہ گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہوتی تو فیض علی سے محبت کرلیتی۔ دلاور خان اور پیر بخش جیسے منتقم مزاج اور ظالم افراد بھی اس تہذیب کا ایک ناگوار حصہ تھے جنہوں نے امیرن کو اغوا کرکے ایک ایسے بدلحاظ اور ہیبت ناک معاشرے میں لا پھینکا جہاں اس کا مقدر محض بدنامی، ذلت اور رسوائی تک محدود ہوگیا۔ اسی طرح میاں حسنو جیسے مطلب پرست، بے مروت اور بدلحاظ افراد بھی اس تہذیب میں نمایاں تھے۔ جن کے نزدیک انسانیت جیسے الفاظ کے کوئی معنی نہ تھے۔ مزید براں گوہر مرزا جیسے لوگ جن میں مردانہ ہمت برائے نام تھی اور جو طوائفوں کے ٹکڑوں پر پہل کر زندگی گزارتے تھے، ایک ایسے امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انتہائی افسوس ناک ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس دور میں گوہر مرزا جیسے ہزاروں لوگ موجود تھے جن کی روزی کوٹھے سے وابستہ تھی اور جو طوائفوں کے مرہون منت نظر آتے تھے۔

البتہ ان تمام منفی پہلوؤں کے باوجود لکھنوی تہذیب میں شائستگی، وضع داری اور مروت قابلِ دید تھی۔ لوگوں کا ادبی ذوق و شوق، سخن فہمی، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، طرزِ رہائش، کھانا پینا، اوڑھنا بچھوڑنا بہت عمدہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کا لحاظ کرنا اور عزت و احترام سے پیش آنا اس دور کے بیشتر افراد کی عادات میں شامل تھا۔ ایسے لوگوں کے یہ رویے ہی لکھنوی تہذیب کو آج بھی پرکشش بنادیتے ہیں۔ نواب چھبن نے خانم کے کوٹھے سے رخصت کردیے جانے کے بعد پھ کبھی وہاں کا رخ بھی نہ کیا۔ یہ ان کی انا اور کی دلیل ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لکھنوی تہذیب کے منفی اور مثبت پہلو، دونوں ہیں۔ البتہ منفی پہلو اس تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو مغلوب کرتے ہیں اور یوں ناول "امراؤ جان ادا" لکھنوی تہذیب اور ثقافت کے منفی و مثبت پہلوؤں کا خوبصورت امتزاج ہے۔

س: "امراؤ جان ادا" میں ایک گھریلو عورت اور ایک طوائف کا تصادم نظر آتا ہے۔ ناول کی روشنی میں اس بیان پر تبصرہ کیجیے۔

ج: امراؤ جان ادا اس ناول کا مرکزی کردار ہے اس کردار کا حسن، اس کی خوبصورتی، اس کی ذہانت اور حالات و واقعات کی بدولت اس کی زندگی میں پیش آنے والی ان گنت تبدیلیاں اس کردار کو مزید دلکش اور پُرکشش بنا دیتی ہیں۔ امراؤ کا کردار کثیر الجہت ہے۔ کبھی تو یہ ہمیں فیض آباد کی اغوا شدہ امیرن کے روپ میں نظر آتی ہے جو اپنی تمام زندگی حتیٰ کہ آخری دم تک بھی اپنے ماں باپ اور بھائی کو دیکھنے کے لیے ترستی رہتی ہے تو کبھی یہ ہمیں اس مشہور سوز خاں کے روپ میں نظر آتی ہے جس کو شاہی دربار تک رسائی حاصل تھی اور جس کی شاعری اور گلے کی دھوم پورے لکھنو میں تھی۔

امراؤ محض تو دس برس کی تھی جب اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس وقت اس کا نام امیرن تھا۔ امیرن کے والد نے دلاور خان کے خلاف گواہی دے کر اسے جیل تک پہنچایا۔ جب وہ اپنی سزا کاٹ کے لوٹا تو انتقام لینے کے لیے اس کی بیٹی یعنی کے

امیرن کو اغوا کر کے خانم کے کوٹھے پر بیچ ڈالا اور یوں اسے ایک خوشحال اور نیک نام معاشرے سے لا کر لکھنو کے ایک ایسے ہیبت ناک معاشرے میں پھینکا جہاں اس کا مقدر محض بدنامی ذلت اور رسوائی تک ہی محدود ہو گیا۔ البتہ کوٹھے پر خانم اور خاص طور پر مولوی صاحب اور بوا حسینی نے اس کا بہت خیال رکھا۔ خورشید جان، گوہر مرزا، بسم اللہ اور امیر جان جیسے ساتھیوں اور دوستوں میں اس کا بچپن نہ جانے کب اور کیسے گزر گیا اور صرف چند ہی دنوں میں اپنے والدین کو بھول گئی۔

اپنی جوانی کے آغاز سے ہی امراؤ کے پیشے کا آغاز بھی ہو گیا۔ وہ پہلی بار نواب راشد علی خان کے ہاتھ بکی اور پھر نواب سلطان اور بعد ازاں فیض علی کے ساتھ تعلق بنا۔ گوہر مرزا تو ہمیشہ سے ہی اس کے ساتھ تھا۔ امراؤ ایک طوائف ہونے کی حیثیت سے ہوشیار اور ذہین تھی۔ لیکن وہ اس سب کے باوجود باقی رنڈیوں سے مختلف تھی۔ وہ اپنے پرستاروں اور عاشقوں کو فریب دینا اور اپنے عشق کے جال میں پھنسا کر رکھنا جانتی تھی لیکن بسم اللہ جیسی بدلحاظ اور مطلب پرست بھی نہ تھی اس نے نواب سلطان کو ٹوٹ کر چاہا تھا لیکن خورشید کی طرح اپنے آپ کو تماشا نہیں بنوایا۔ البتہ امراؤ نے فیض علی کے ساتھ تعلق میں خالص رنڈی پنے کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس پر بہت سامال لٹاتا تھا۔ یہاں تک کہ امراؤ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ اگ وہ ابتدا ہی سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہوتی تو ضرور فیض علی سے محبت کرتی۔ اس کے باوجود امراؤ کے اندر "امیرن" ابھی بھی باقی تھی۔ اس مین وہ انسانیت تھی جو ایک رنڈی میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امراؤ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھتی تھی۔ جب بسم اللہ نے اپنے عاشق مولوی صاحب کو درخت پر چڑھنے پر مجبور کر دیا تو امراؤ نے ان کی سفارش کر کے انھیں نیچے اترنے میں مدد کی۔ جب بسم اللہ اکثر اپنی ماں یعنی کے خانم سے لڑ جھگڑ کر کوٹھا چوڑ کے چلی جاتی۔ اس نے خانم کو اتنے دکھ دیے کہ خانم ک اس سے نفرت سی ہونے لگی۔ لیکن امراؤ نے جتنا عرصہ خانم کے کوٹھے پر گزارا، ایسے شکایت کا کوئی مواقع نہ دیا اور نہ ہی کبھی خانم سے ناراضگی کا اظہار کیا۔

امراؤ نے نواب سلطان سے حقیقی محبت کی اور ایک ہم مزاج اور باذوق انسان کی حیثیت سے انہیں چاہا جب اسے معلوم ہوا کہ رام دئی جو اس کے ساتھ ہی اغوا ہوئی بیگم بنی بیٹھی ہے اور وہ خود کوٹھے پر پلی بڑھی تو اسے اپنی قسمت پر بڑا رنج ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ نواب سلطان رام دئی کا خاوند نکلا۔ امراؤ نے اپنی قسمت اور تقدیر کو کوسا لیکن اپنی وضع داری ایسی نبھائی کہ ایسی کوئی بات تک نہ کی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ نواب کو جانتی تھی۔ یہاں امراؤ کا رویہ ایک رنڈی نہیں بلکہ ایک مہذب عورت کے رویے جیسا ہے۔ اس نے نواب کو نہ جاننے کا یہ تاثر اس لیے دیا کہ رام دئی اور اس کے خاوند کے آپس کے تعلقات اثر انداز نہ ہوں۔

ایک رنڈی ہونے کی وجہ سے امراؤ میں یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے پرستاروں کو فریب دے سکے لیکن ایسے پیشے میں رہ کر بھی اس نے اپنے اندر کی عورت کو قتل نہ کیا۔ تمام زندگی اس کی یہ خواہش رہی کہ وہ اپنے گھر والوں سے ملے اور اس کی زنگی میں کوئی ایسا

چاہنے والا ہو جو اس کا سچا عاشق ہو اور اس ک ناز برداری کرے۔ یہ خواہش خالصتاً ایک عورت کی خواہش ہے کیونکہ ایک رنڈی تو یہ تسلیم کرلیتی ہے کہ کوئی اسے کبھی سچے دل سے نہیں چاہے گا۔ الغرض امراؤ کا کردار ایک طوائف کا کردار ہے جس میں انسانیت باقی تھی۔ وہ ایک متوازن شخصیت کی مالک تھی جس کا کردار ایک گھریلو عورت اور ایک بازاری طوائف کے کرداروں کا حسین امتزاج ہے۔

امراؤ جان ادا اپنے پلاٹ کے اعتبار سے ایک شاہکار ناول ہے؟ تبصرہ کریں۔

یا

کیا امراؤ جان ادا کے مردانہ کردار محض مجہول ہیں؟

س2: ناول "امراؤ جان ادا کے مردانہ کردار اس کا ایک ایسا اہم حصّہ ہیں جس کے بغیر کہانی نامکمل سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کردار بے شک بہت سی جگھوں پر غیر فعال محسوس ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی موجودگی کہانی کو آگ لیجانے میں

معاون و مدد گار ثابت ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس نوال کے نواب مردانہ کرداروں میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس دور کی عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے ، ایک ایسا دور تھا جب بڑے بڑے نواب اور رئیس زادے طوائف کے بالاخانے پر جانے کو اپنی شان و شوکت میں اضافے کا باعث سمجھتے تھے۔ لہذا نوابوں کے بغیر ایک رنڈی اور اس کا کوٹھا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ طوائفوں کے کوٹھے انہی کے دم سے چلتے تھے۔

نواب سلطان ناول کے مرکزی کرداروں میں سے ایک ہیں اور ان کے ساتھ امراؤ کا حقیقی عشق ان کو مردانہ کراروں میں مرکز اہمیت دیتا ہے۔ یہ کردار لکھنو کے ان پڑھے لکھے اور شائستہ نوابوں کی عکاسی کرتا ہے جو غایت اور شرافت کا نمونہ تھے۔ یہ طوائفوں کے ٹکڑوں پر پلنے والے لوگوں میں سے نہیں تھے بلکہ ان کی دولت کے بل بوتے پر تو خود طوائفوں کے بالاخانے پر چلتے تھے۔ اس کے برعکس گوہر مرزا جیسے کردار بھی اس ناول کا حصہ ہیں جن میں مردانہ خصوصیات برائے نام ہی تھیں۔ گوہر مرزا کے ساتھ امراؤ کا تعلق ایک ضرورت کا تعلق تھا۔ امراؤ کو اس کی ضرورت تھی اور اس کو امراؤ کی۔ یوں گوہر مرزا کے ساتھ امراؤ کا تعلق محض مجبوری کے تحت تھا۔ درحقیقت گوہر مرزا ان کرداروں کی عکاسی کرتا ہے جو طوائفوں کے مرہونِ منت رہتے تھے اور ان کی روزی روٹی بالاخانے کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امراؤ کو کبھی اس سے سچی محبت نہ تھی کیونکہ اس شخص میں مردانہ ہمت تو تھی ہی نہیں اور وہ عورتوں کو تحفظ نہیں دے سکتا تھا جس کی ضرورت ایک عورت کی نفسیات کا حصہ ہوتی ہے۔

فضل علی اور فیض لکھنو کے ڈاکوؤں اور چوروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ چوری اور ڈاکوؤں سے کمائی ہوئی دولت یہ طوائفوں کے کوٹھوں پر خوب لٹاتے تھے۔ اور یوں ان کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ طوائفوں اور مجرموں کا ایک دوسرے سے تعلق ہمیشہ سے رہا ہے۔ فیض علی بھی ایک ایسا ہی مجرم تھا اس کی وضع شہر کے بانکوں جیسی تھی۔ ادب و آداب اور شائستگی اس کے کردار کا حصّہ نہ تھی۔ دوسرے کرداروں کے مقابلے میں یہ کردار زیادہ فعال محسوس ہوتا ہے جو کہانی میں ہلچل پیدا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ مولوی صاحبان اس ناول کے واقعات کو ترتیب دینے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ لکھنوی تہذیب کے ان لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو مذہب سے وابستہ ہونے کے باوجود طوائفوں کی محفلوں اور رقص و سرود سے کنارا کشی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں طوائف اتنی اہمیت حاصل کر چکی تھی اور تہذیب کا مرکز بن گئی تھی کہ اس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق لازمی بن چکا تھا۔ جو مولوی صاحب بوا حسینی کے ساتھ رہتے تھے ، زید پور کے اچھے خاصے کھاتے پیتے ، بال بچے دار شخص تھے۔ حصولِ علم کے لیے لکھنو آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ وہ خانم کے کوٹھے پر رنڈیوں کو تعلیم دیتے تھے۔ امراؤ نے عربی اور فارسی مین ان سے خوب کسبِ فیض کیا اسی طرح جو مولوی صاحب بسم اللہ پر جان دیتے تھے۔

اس دور کے ان لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں جو بظاہر تو عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے "اور ایسے ویسے مولوی نہ تھے "لیکن ایک طوائف سے تعلق رکھنے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔"

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول "امراؤ جان ادا" کے مرکزی کردار ہر گز مجہول نہیں۔ نواب سلطان اور فیض علی کردار کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے لازمی محسوس ہوتے ہیں جبکہ گوہر مرزا اور مولوی صاحب جیسے کردار امراؤ کی روزمرہ زندگی میں موجود لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مزید برآں ہر مردانہ کردار لکھنو کے اس دور کے لوگوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کردار لکھنوی تہذیب اور روایات سے پھوٹے ہیں اور اس معاشرے کی اجتماعی نفسیات کی غماز ہیں۔

س: امراؤ جان ادا کے کردار میں ایک مجبور اور بے بس عورت کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس بارے میں اپنی رائے کا تفصیل سے اظہار کیجیے۔

ج: اردو کے نثری ادب میں امراؤجان ادا کر کردار غالباً سب سے زیادہ دلکش اور اہم کردار ہے۔ اس کردار کی خوبصورتی، ذہانت، ادبی ذوق وشوق، گائکی اور سب سے بڑھ کر حالات وواقعات کے سامنے اس کی بے بسی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ امراؤ کی زندگی کا المیہ یہ تھا کہ اس نے خود اپنے لیے یہ پیشہ نہیں چنا تھابلکہ تقدیر نے اسے زندگی کے ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا کہ اس کے پاس ماسوا افسوس اور اپنے ماضی کی یادوں کے کچھ بھ نہ بچا۔

امراؤ کے کردار میں ایک مجبور اور بے بس عورت کی جھلک پہلی مرتبہ دکھائی دیتی ہے جب وہ امراؤ نہیں بلکہ امیرن تھی اور دلاور خان اور پیر بخش جیسے جفاکاروں نے اسے اغوا کر کے لکھنو پہنچایا اور خانم کے کوٹھے پر بیچ ڈالا۔ یوں وہ دونوں امراؤ کو ایک عزت دار اور شریف معاشرے سے نکال کر ایک ہیبت ناک اور بدنام معاشرے میں پھینکنے کے ذمہ دار ہوئے۔ ایک طوائف کا پیشہ اپنانا اس کے لیے ہر گز آسان نہ تھا۔ یہ زندگی اس نے اپنے لیے خود نہیں مانگی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو تقدیر اور حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا اور یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ اسے اپنی زندگی اسی ماحول کے مطابق گزارنی پڑے گی۔

نواب سلطان امراؤ کی زندگ میں ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آیا۔ امراؤ کو اس سے حقیقی عشق ہوا اور اس نے نواب کو ایک ہم مزاج اور باذوق انسان ہونے کی حیثیت سے چاہا لیکن نواب سلطان کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ ناول میں واضح نہیں ہو سکی۔ لیکن اس ضمن میں امراؤ نے اتنا کہا ہے کہ "مگر افسوس فلکِ تفرقہ انداز نے یہ سلسلہ بہت جلد درہم برہم کر دیا"۔ جب امراؤ کو اس بات کا ادراک ہوا کہ رام دئی جو اس کے ساتھ کریم کے گھر پر اغوا ہو کر آئی تھی نواب سلطان کی بیوی ہے تو امراؤ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ اس کی تقدیر بہت خراب تھی جس نے اسے ایک طوائف کے کوٹھے پر پہنچا دیا۔ اس بات سے امراؤ کی بے بسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اس کو اپنی قسمت پر اختیار ہوتا تو وہ ہر گز نواب سلطان کو خود سے جدا نہ ہونے دیتی۔ اسی طرح امراؤ نے فیض علی سے بھی دلی محبت نہ کی لیکن مجبوری کے تحت اس کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھا۔ اس کی مجبوری کی بنیادی وجہ فیض علی کی دولت تھی۔ فیض علی اپنا چوری شدہ مال امراؤ کا دیا کرتا اور اور اس کی اسی عادت کے سامنے امراؤ بے بس ہوتی چلی گئی۔ مزید برآں گوہر مرزا کی چاہت کو اس نے اتنی اہمی نہ دی۔ جتنی کہ ایک عورت کی نفسیات کا حصہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گوہر کے ساتھ اس کا تعلق ضرورت اور مجبوری کا تعلق تھا۔ اس کو اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو اس کی مدد کرنا اور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو امراؤجان کا کردار ایک ایسی بے بس عورت کا کردار ہے جو اس ناگوار حقیقت سے واقف تھی کہ وہ حالات کی سختیوں کا شکار ہے۔ لیکن اسے تمام صورتِ حال پر کوئی اختیار نہ تھا۔ امراؤ کی یہ بے بسی درحقیقت ایک انسان کی حالات کے سامنے بے بسی کی عکاس ہے۔

س: لکھنو کے زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کے لیے ایک طوائف کا انتخاب کیوں؟ تفصیل سے تبصرہ کریں۔

ج: ناول "امراؤ جان ادا" ایک طوائف کی کہانی ہے اس ناول کے تمام واقعات امراؤ جان کے کردار کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں لکھنو کے زوال پذیر معاشرے کی تصویر کشی کے لیے امراؤ کے کردار کا انتخاب کیا۔ اور اس کردار کے آئینے میں لکھنو کی تہذیبی وراثت دکھائی۔ امراؤ جان ادا در حقیقت وہ آنکھ ہے جس کے ذریعے مرزا رسوا نے اس دور کے لکھنو کا ہر منظر دیکھا اور قاری کو دکھایا۔

"امراؤ جان ادا" اس دور کی کہانی ہے جب لکھنوی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ میلے، سیر گاہیں، تعزیہ، محرم کے جلوس اور سب سے بڑھ کر خانم جیسی طوائفوں کے بالا خانے اس تہذیب کا مرکز تھے۔ خاص طور پر خانم کا بالا خانہ ایک ایسا مقام بن کر سامنے آتا ہے۔ جس میں لکھن کے اس زوال پذیر معاشرے کی تصویر آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتی ہے۔ امراؤ نے کہا تھا "یہ وہ جگہ تھی جہاں ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملتا تھا، ملا"۔ خانم ایک طوائف تھی جس کے کوٹھے کا اندرونی ماحول اور یہاں پر آنے والے پرونی لوگ لکھنوی تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نوچیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے والے استاد صاحب سے لے کر چالیس سال سے خانم کی خدمت میں حاضر ہونے والے خان صاحب تک اور نواب چھبن جیسے نوجز رئیس زادے سے لے کر نواب جعفر جیسے ستر سالہ تماش بین تک، تمام افراد لکھنوی تہذیب و ثقافت سے پھوٹے ہیں اور معاشرے کی اجتماعی نفسیات کے غماز ہیں۔

امراؤ جان ایک طوائف تھی اور انیسویں صدی میں طوائف لکھنوی تہذی کا مرکز و محور تھی۔ ایک طوائف کے ساتھ تعلق رکھنا بڑے بڑے نوابوں اور رئیس زادوں کے لیے عزت افزائی کا باعث ہوتا۔ نواب راشد علی خان جن کے ساتھ امراؤ کی مسی ہوئی تھی، دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ماضی میں ان کا بہت سی طوائفوں کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ نائکاؤں کو اماں جان کہتے تھے۔ یہ کردار اپنے دور کی روایات کی عکاسی کرتا ہے اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے طبقۂ اشرافیہ کی کیا حالت تھی۔ طوائفوں کے ساتھ تعلق رکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ معمول کی بات تھی تمام نوابوں کی بیگمات اس

حقیقت سے واقف تھیں۔ البتہ کوٹھوں پر جانا زیادہ تر نوجوانوں کا مشغلہ لگتا تھا۔ مثلاً نواب چھبن اور نواب سلطان دونوں اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ہی طوائفوں سے تعلق وابستہ کر چکے تھے۔

اس دور میں طوائف اتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ مذہبی طبقوں سے تعلق رکھنے والے مولوی صاحبان جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ طوائفوں کے کوٹھوں اور رقص و سرود کی محفلوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں، تک طوائفوں کے چنگل سے بچ نہیں پاتے اور ان کے ساتھ تعلق استوار رکھتے تھے۔ اسی طرح خانم کے کردار کے ذریعے لکھنوی تہذیب کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ خانم اپنے دور کی مشہور و معروف نائیکہ تھی اور وہ اتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ بڑے بڑے نواب اس کی قدموں میں بیٹھتے تھے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے تھے اور تو اور ان کے بزرگ ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے خانم کے مرہونِ منت ہوتے تھے مثلاً نواب چھبن کی والدہ خود خانم کے پاس آئیں اور یہ گزارش کی کہ وہ نواب کو کسی طرا اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کرنے پر رضامند کر دیں۔ خانم کا کردار لکھنوی تہذی کے ظاہری پہلو کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ یہ کردار بذاتِ خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتا ہے اس کا حلیہ، اندازِ گفتگو، عمدہ لاس، مہنگا زیور، بان دان، پیچوان اور شان و شوکت لکھنوی تہذیبی روایات اور ادب و آداب کی نمائندگی کرتا ہے۔

مرزا رسوا نے لکھنو کے زوال پذیر معاشرے کی نمائندگی کے لیے ایک طوائف کا کردار اس لیے چنا کہ اس دور میں طوائف بے مثال اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ طوائف اس دور کے رئیس لوگوں کی زندگیوں کا اہم حصہ تھی، بقول امراؤ رنڈی رکھنا اس زمانے کا فیشن تھا اور کوئی ایسا رئیس نہ تھا جس نے رنڈی نہ رکھی۔ در حقیقت مرزا رسوا نے ایک طوائف اور اس سے وابستہ تمام مشاغل کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ عیش و عشرت کے عکاس ہیں۔ رسوا نے دراصل یہ بتانا چاہا ہے کہ جب معاشرے کا ہر شخص عیش پرستی کے نشے میں گم ہو اور خاص طور پر رئیس طبقہ اپنی لت ان کاموں پر لٹانا شروع کر دے تو معاشرے کی اجتماعی فضا اور اخلاقی کیفیت پر کتنا منفی اثر پڑتا ہے۔

شاعروں پر نوٹ:

گرم کوٹ

راجندر بیدی کا افسانہ "گرم کوٹ "ہمارے معاشرے کے سفید پوش طبقے کی مجبوریوں، قربانیوں اور محبتوں کی کہانی ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار ایک متوسط طبقے کا فرد ہے جو امیروں کی طرح قیمتی کپڑے پہننے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اور نیا کوٹ اس لیے نہیں خرید تا کہ اگر وہ نیا کوٹ خرید لے گا تو اس کے بیوی بچوں کا خرچ کیسے پورا ہو گا۔ کم آمدنی کے ساتھ اس کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک ذہین اور مفکر قسم کا آدمی ہے جو اپنی مجبوریوں کا تجزیہ کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ مزید مشکل کا شکار رہتا ہے۔ اس کی بیوی شمی اسکی زندگی کی تمام مشکلات میں اس کی شریک ہے اور ہر معاملے میں اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے لیکن وہ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کی خاطر قربانی دینے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ذات کی بجائے انہیں زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

اس کردار کی گھر کی زندگی کے علاوہ باہر کی بھی ایک زندگی ہے اور اس زندگی میں وہ ہمیشہ احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے کیونکہ اس کے دوستوں کے پاس بڑے اچھے اور خوبصورت سوٹ نظر آتے ہیں۔ جبکہ اس کا اپنا کوٹ ہمیشہ پھٹا پُرانا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس احساس کمتری کو چھپانے کے لیے اپنے آپ کو دلائل دیتا رہتا ہے اور اس بات پر اسے اندر ہی اندر دکھ بھی ہے کہ اس کے دوست اس کا دل رکھنے کے لیے اکثر کہتے رہتے ہیں کہ وہ اچھے لباس کی بجائے رفعتِ ذہنی کی زیادہ پرواکرتے ہیں۔ بہر حال بیرونی زندگی میں تمام تر محرومیوں اور مشکلات کے باوجود وہ اپنے بچوں اور اپنی بیوی کے لیے قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے یہاں تک کہ جب اس کا کھویا ہوا دس روپے کا نوٹ اس مل جاتا ہے تو وہ اپنے پھٹے پُرانے کوٹ کی طرف توجہ نہیں دیتا اور دیوانہ وار گھر کی طرف جاتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے مختلف چیزوں کی فہرست بنانا شروع کر دیتا ہے۔

اس کردار کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بھی مشرقی معاشرے کی ایک مکمل عورت کا نمائندہ کردار ہے۔ وہ بھی اپنے میاں اور بچوں کے لیے سراپا ایثار نظر آتی ہے۔ اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ گھر کی ذمہ داریاں سنبھالے اور کم سے کم وسائل میں گزارہ کر کے اپنے میاں کو بہتر زندگی فراہم کرے۔ جب مصنف کو کھویا ہوا نوٹ مل جاتا ہے تو وہ بچوں اور اپنے لیے بنی ہوئی فہرست پھاڑ دیتی ہے اور دس روپے میں گھر کے خرچ سے مزید پیسے ملا کر اس کے لیے ایک قیمتی کوٹ کا کپڑا خرید لیتی ہے۔

یہ افسانہ درحقیقت محرومیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ایسے انسانوں کی کہانی ہے جو یا تو اپنی ضرورت پوری کرسکتے ہیں یا اپنے چاہنے والوں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کی خوشی دوسرے کی محرومی بن جاتی ہے اور اس طرح زندگی کبھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ البتہ ان کی محبتیں ایک دوسرے کی محرومیوں کی تلافی کرتی ہیں اور وہ اپنے وسائل کی کمی آپس کے پیار اور محبت سے پوری کرلیتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی گرم کوٹ اس محبت کا استعارہ ہے جو ایک بیوی اپنے میاں سے کرتی ہے۔

ننھی کی نانی

عصمت چغتائی کا یہ افسانہ بنیادی طور پر کردار نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ تیسری دنیا کے غریب اور مفلوک الحال معاشرے میں ایک بیوہ عورت زندہ رہنے کے لیے جتنی تگ ودو کرسکتی ہے، سب اس افسانے کا حصّہ ہے۔ ننھی کی نانی افسانے کا بنیادی کردار ہے۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جس کی اپنی کوئی پہچان نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر عورتیں ایسی ہیں جو ہمیشہ دوسروں کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ ننھی کی نانی غربت کے اس درجے پر تھی جہاں زندگی کی جدوجہد کے لیے اس کے پاس اپنی ذات کے سِوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں اسی جیسے یا اس سے ذرا بہتر لوگ رہتے تھے۔ یا پھر ڈپٹی صاحب جیسے لوگ تھے جن کے نزدیک انسانیت کا مفہوم کچھ بھی نہیں تھا۔

اس محلے میں زندگی گزارنے کے لیے ننھی کی نانی نے ہر طرح کے جتن کیے۔ اس نے اوپر کا کام کرنے سے لے کر بھیک مانگنے، چوری کرنے یہاں تک کہ بچوں سے چھین کر کھانے جیسے کام کیے۔ یہ تمام کام اس کے نزدیک زندگی کی جدوجہد کا حصّہ تھے مگر اسے احساس تھا کہ اس نے لوگوں کے سامنے اپنا بھرم بھی رکھنا ہے۔ نانی کا برقعہ اگرچہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ تھا، لیکن یہی برقعہ اس کی پناہ گاہ بھی تھا۔ اپنی انا اور عزتِ نفس کا بھرم رکھنے کے لیے وہ اپنی ذات کو اسی برقعے میں چھپائے رکھتی تھی وہ جانتی تھی کہ اس کے اعمال اس قابل نہیں ہیں کہ دوسروں کے سامنے ظاہر ہو سکیں۔ اسی لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی زندگی دوسروں سے پوشیدہ رکھے۔

خوراک، ننھی کی نانی کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ کاش اللہ نے انسانوں کے اندر بھی اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو وہ چار دن کی خوراک پیٹ میں بھر کر مزے سے بیٹھ جاتی لیکن وہ ایک وقت میں جتنا کھا سکتی تھی، کھا لیتی اور باقی ٹکڑے سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیتی تھی۔ اس موڑ پر افسانہ ترقی پسند نظریات کی طرف پلٹتا نظر آتا ہے۔ اشتراکیت کے ماننے والوں کے نزدیک خوراک انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ننھی کی نانی کا بھی یہی مسئلہ تھا۔

ننھی کی نانی کا تکیہ اس کی ذات کا استعارہ تھا جس طرح اس نے اپنے دل میں ہزاروں راز چھپا رکھے تھے اسی طرح اس تکیے میں بھی اس کی گزشتہ زندگی کے سارے پہلو پوشیدہ تھے۔ اس کی چوریاں، اس کی برائیاں اور اس کے ماضی کی یادیں اس تکیے میں موجود اثاثے کا حصہ تھیں۔ وہ ان یادوں اور ان تمام اعمال کو دنیا سے چھپا کر رکھنا چاہتی تھی لیکن ایک معمولی بندر کے ہاتھوں اس کا راز اس طرح طشت از بام ہوا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے جوگی نہ رہی۔

ننھی کی نانی کی زندگی اس معاشرے کے لیے باعثِ شرم تھی۔ اس کا ٹیڑھا پن درحقیقت اس معاشرے پر بہت بڑا طنز ہے۔ وہ مر کر بھی سیدھی نہ ہوئی اور یہی وہ گالی تھی جو وہ اس دنیا کو دے کر چلی گئی۔

نظارہ درمیان سے

خورشید عالم کا کردار:

اس افسانے میں خورشید عالم کا کردار ایک ایسے ہندوستانی نوجوان کا کردار ہے جو ایک طرف تو معاشی تحفظ چاہتا تھا اور دوسری طرف اپنی محبت سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا وہ ایک محنتی انسان تھا جو بڑی جدوجہد سے پیرس پہنچا اور اپنی بے تکلفی اور خوش مزاجی کی وجہ سے پیروجا جیسی خوبصورت لڑکی کا منگیتر بن گیا۔ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو اس نے پیروجا کو بھلای نہیں بلکہ الماس اور اس کے دولت مند باپ کی طرف سے لالچ ملنے کے باوجود پیروجا کا انتظار کرتا رہا۔

خورشید عالم ہندوستانی معاشرے کا وہ نوجوان ہے جس پر اس کے خاندان اور معاشرے کے حالات کی وجہ سے بہت دباؤ ہوتا ہے۔ اس کا باپ یہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا فرانس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک امیر کبیر مسلمان رئیس زادی سے شادی کرنے کی بجائے ایک مفلو کمال پارسی عورت سے شادی کرے۔ اسی غم سے وہ بیمار ہو گیا تھا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خورشید عالم پر الماس سے شادی کرنے کے لیے کتنا دباؤ تھا۔

خورشید عالم ایک صاحبِ کردار آدمی تھا۔ وہ شاید پیروجا کو کبھی نہ چھوڑتا لیکن الماس کے خط کے بعد جب وہ تارویو میں پیروجا کی خبر لینے پہنچا تو اسے پیروجا کی بجری چچی ملی جس نے اس کے سوالوں کے جواب میں ایسے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا کہ خورشید عالم کو یقین ہو گیا کہ الماس نے جو کچھ لکھا تھا وہ درست ہے۔ یہ محض اتفاق اور پیروجا کی بدقسمتی تھی کہ جب خورشید عالم اس کے گھر پہنچا تو وہ جوہو سن اینڈ سینڈ میں ایک امریکی کے بچوں کو پیانو کی ٹیوشن پڑھانے گئی ہوئی تھی۔ خورشید عالم نے یہ سمجھا کہ وہ واقعی اس مریکی کی گرل فرینڈ ہے۔

مجموعی طور پر یہ ایک شریف آدمی کا کردار ہے جو معاشرے کے دوسرے انسانوں کی طرح تمام کمزوریوں کا شکار ہے۔ اسے معاشی تحفظ کی ضرورت ہے جس کی خاطر وہ اپنا وائلن بجانے کا شوق بھی چھوڑ چکا ہے۔ پیروجا کی محبت اسے کے مرنے کے بعد بھی خورشید عالم کے دل میں موجود تھی۔ اسی لیے وہ سوچا کرتا تھا کہ جب اس کی روح آسمان پر پہنچی ہو گی تو کیا ہوا ہو گا۔

الماس کا کردار:

افسانہ "نظارہ درمیان ہے "میں الماس منفی کردار ہے۔ وہ ڈھلتی ہوئی عمر کی ایک دولت مند لڑکی ہے جسے تارابائی کے بقول "بھگوان نے دولت بھی دی، اجت بھی اور ایسا سندر پتی بھی بس شکل دینے میں کنجوسی کر گئے "۔ الماس کا باپ بمبئی کا بہت بڑا تاجر ہے اور وہ بمبئی کے بہت مہنگے علاقے، کمبالاہل میں رہتی ہے۔ الماس کا مسئلہ یہ تھا کہ معمولی شکل وصورت اور زیادہ عمر کی وجہ سے اس کی شادی کا امکان بہت کم رہ گیا تھا۔ اسی لیے جب اس کی تجربہ کار خالہ، بیگم عثمانی نے خورشید عالم کا سراغ لگالیا تو الماس نے خورشید عالم سے شادی کے لیے ہر جائز یاناجائز ذریعہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

الماس فطرتاً ایک کینہ پرور اور درشت مزاج عورت تھی۔ اسے اپنی دولت کا غرور بھی بہت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کم عمر اور خوبصورت لڑکیوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جب اسکی ملاقات پیروجا سے ہوئی تو اس کا ابتدائی ردِ عمل یہی تھا لیکن وہ اتنی چالاک تھی کہ اس نے پیروجا کی حقیقت جاننے کے لیے فوراً خوش اخلاقی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کا ذہن سازشی تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی مکاری اور ہوشیاری سے پیروجا کی حقیقت معلوم کرلی اور خورشید عالم کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ایک طرف تو پیروجا کو یہ بتایا کہ خورشید عالم اس کا منگیتر ہے اور دوسری طرف خورشید الم کو خط لکھ کر اس کے دل میں پیروجا کی طرف سے یہ غلط فہمی ڈال دی کہ پیروجا بد کردار ہے اور کسی امریکی کے ساتھ اس کے گھر مقیم ہے۔

الماس انسانی نفسیات سے واقف تھی اور دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا خوب جانتی تھی۔ اس نے خورشید عالم کی مجبوری اور غربت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس کے بیمار والد کے علاج کی پیش کش کی اور اسے معاشی سہارا دیا اس معاملے میں اسے اپنے باپ کی معونت بھی حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بے حد شکی مزاج تھی اور ہر چیز کو اپنے ناطع اور قبضے میں رکھنا چاہتی تھی۔ شادی کے بعد خورشید عالم کے ساتھ اس کا رویہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خورشید عالم کو اپنے دباؤ میں رکھنا چاہتی

تھی اور کسی صورت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کی نظروں سے دور رہ کر کوئی کام کر سکے وہ خورشید عالم کے دل سے پیروجا کی ہر یاد مٹا دینا چاہت تھی۔ تاکہ خورشید عالم ہمیشہ کے لیے اسی کا ہو کر رہ جائے۔

الماس کے کردار میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی المیہ افسانے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ پیروجا کے مقابلے میں وہ اتنی زیادہ جہاں دیدہ اور زمانہ ساز محسوس ہوتی ہے کہ پیروجا جیسی معصوم اور سادہ لڑکی کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

نظارہ درمیان ہے۔ تنقیدی جائزہ

قرۃ العین حیدر کا افسانہ "نظارہ درمیان ہے" ہندوستان میں طبقاتی تقسیم، معاشی ار معاشرتی اونچ نیچ اور صاحب ثروت لوگوں کی طرف سے غریبوں کے جذباتی استحصال کی کہانی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک رومانی افسانہ ہے جس میں ایک محبت کرنے والی لڑکی کی آنکھیں اس کی موت کے بعد بھی اپنے محبوب کو دیکھتی رہتی ہیں۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو خالصتاً رومانی دور سے لیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے خوبصورت جاندار اور اسلوب کی مدد سے اس کہانی کو ایک شاہکار بنا دیا ہے۔

اس کہانی کے تین مرکزی کردار ہیں۔ خورشید عالم ایک غریب انسان ہے وہ پرتاپ گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ اور انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے وظیفے پر پیرس گئے تھے۔ پیرس میں ان کی ملاقات پیروجا دستور جہانگیر نامی ایک ہندوستانی لڑکی سے ہوئی۔ جو پیرس میں موسیقی کی تعلیم حاصل کررہی تھی۔ یہ لڑکی ہندوستان کے غریب طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے اور بمبئی میں غریب پارسیوں کے ایک محلے تارویو میں اس کا گھر تھا۔ خورشید عالم کو اس سے محبت ہوگئی دونوں نے منگنی کرلی۔ پیروجا کے قیام کا کچھ عرصہ باقی تھا کہ خورشید عالم پیرس سے واپس ہندوستان آگئے اور یہاں ملازمت تلاش کرنے لگے۔

ہندوستان میں الماس نامی ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی بدصورت لیکن دولت مند لڑکی نے شادی کی غرض سے خورشید عالم کو تاک لیا۔ اس کے دولت مند باپ نے خورشید عالم کو ملازمت دے دی اور جب خورشید عالم اپنے بیمار باپ کے پاس گاؤں گئے ہوئے تھے تو اتفاق سے پیروجہ ہندوستان پہنچی اور مزید اتفاق یہ ہوا کہ آتے ہی اس کی ملاقات الماس سے ہوگئی۔ الماس بہت جلد سمجھ گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا خورشید عالم کو انتظار تھا۔ اس نے دونوں کے درمیان ایسی غلط فہمی پیدا کی کہ خورشید عالم نہ چاہنے کے باوجود پیروجا کو چھوڑ کر الماس سے شادی کرنے پر مجبور ہوگئے۔

خورشید عالم کی جدائی نے پیروجہ کو بیمار کردیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی آنکھیں خیرات کردیں۔ الماس کے ایک واقف ڈاکٹر صدیقی نے اس کی آنکھیں ایک غریب لڑکی تارابائی کو لگادیں اور اتفاق سے وہی لڑکی خورشید عالم اور الماس کے گھر نوکرانی کے طور پر آگئی۔ جب ڈاکٹر صدیقی کی زبانی الماس اور خورشید عالم کو پتہ چلا کہ تارابائی کے چہرے پر پیروجہ دستور کی آنکھیں ہیں تو وہ دونوں حیران پریشان رہ گئے۔

مجموعی طور پر افسانے کی فضا رومانی ہے۔ پیروجہ اور خورشید عالم کی محبت دونوں کا موسیقی سے تعلق بمبئی کا ماحول، تاج محل کی دعوتیں، الماس کے گھر ہین پارٹی اور سب سے بڑھ کر برج خاموشاں کا جنگل جہاں پارسی اپنے مردہ لوگوں کی لاشیں رکھ کر آتے تھے۔ یہ سب ایک رومانی افسانے کے لوازمات ہیں۔ خاص طور پر برج خاموشاں کے جنگل کا تصور اور وہاں پیروجا جیسی سادہ دل، مخلص اور معصوم لڑکی کا ایک لاش کی صورت میں جانا ایک رومانی المیہ تخلیق کرتا ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا اسلوبِ بیان اور حسنِ ترتیب ہے۔ افسانے کے آغاز میں تارابائی سامنے آتی ہے جو کورشید صاحب کی ہر چیز کو بڑی حیرت سے دیکھتی ہے اور آخر میں قاری کو علم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ تارابائی کے چہرے پر پیروجا کی آنکھیں تھیں۔ اس طرح یہ ایک کامیاب رومانی افسانہ قرار پاتا ہے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سعادت حسن منٹو

س: افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، منٹو کے بے باک اندازِ تحریر کا نمونہ ہے۔ تبصرہ کریں۔

ج: منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" تقسیم ہند کے موضوع پر ان کے ذاتی خیالات اور نظریات کا اظہار ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ ہم شعور کی سطح پر بہت سے سمجھوتے کر لیتے ہیں لیکن اپنے لاشعور میں ہم اس علاقے اور اس زمین سے اپنی وابستگی کبھی ختم نہیں کرتے جہاں ہم پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ ہمارے شعور پر معاشرے کے بہت سے اصولوں، مذہب کے ضابطوں، ہماری اپنی نفسیاتی الجھنوں اور ہماری پسند اور ناپسند کا دباؤ ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے لاشعور میں وہ خالص جذبہ موجزن ہوتا ہے جو ہمارے دل کی آواز ہے منٹو نے اس افسانے میں اپنے نظریے کا اظہار کرنے کے لیے پاگلوں کا انتخاب اسی وجہ سے کیا ہے۔ ایک پاگل انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے شعور سے محروم ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس کا لاشعور اس کی چھٹی حس کی طرح بیدار ہوتا ہے۔ بشن سنگھ جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اس بات کی عمدہ مثال ہے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کی آمد سے قبل ہی جان لیتا تھا کہ کوئی اس سے ملنے آرہا ہے۔ حالانکہ اسے دنوں، مہینوں کا شمار بھول چکا تھا۔ گویا لاشعور زمان و مکان سے بھی ماورا ہوتا ہے۔

منٹو نے بشن سنگھ اور دوسرے پاگلوں کے کرداروں کی مدد سے اس افسانے میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اگر ہم ان پاگلوں کے کرداروں پر غور کریں تو کئی قسم کے ردِ عمل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کچھ پاگلوں کا "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانا، ایک پاگل کا درخت پر چڑھ کر یہ کہنا کہ وہ نہ ہندوستان میں رہے گا، نہ پاکستان میں بلکہ اسی درخت پر رہے گا، پاگلوں کا قائد اعظم محمد علی جناح اور ماسٹر تارہ سنگھ بن کر جھگڑا کرنا اور اینگلو انڈین پاگلوں کا اس فکر میں مبتلا ہونا کہ اب یورپین وارڈ باقی رہے گا یہ نہیں۔ یہ سب لاشعور کی سطح پر ہونے والے ایسے ردِ عمل کی مثالیں ہیں جو ہر انسان محسوس کرتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔ گویا منٹو کے نزدیک تمام صحیح الدماغ لوگوں کا لاشعوری سطح پر ہی ردِ عمل تھا۔ لیکن وہ اپنے شعور کی جکڑ بندیوں کی وجہ سے اس کا کھلا اظہار نہیں کر سکا تھا۔ اس طرح تقسیم ہندوستان ایک غیر فکری عمل تھا جو مصنوعی اصولوں اور غیر ضروری مذہبی جکڑ بندیوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔

افسانے کا مرکزی کردار "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ہے جو اپنی دھرتی سے اتنی گہری وابستگی رکھتا تھا کہ لوگ اسے اس کے علاقے کے نام سے جانتے تھے۔ اس کا نام بشن سنگ تھا لیکن لوگ اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ تقسیمِ ہند کی خبر کا اس پر یہ ردِ عمل ہوا کہ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار ہو گیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں ہے یا پاکستان میں۔ کیونکہ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ وہ اس ملک میں

رہے جہاں اس کا ٹوبہ ٹیک سنگھ نہ ہو۔ اس کے نزدیک اس سے زیادہ اہم بات اور کوئی نہیں تھی کہ وہ اپنے علاقے کے قریب رہے۔ یعنی ایک انسان جنون کے عالم میں، اپنی لاشعوری سطح پر بھی اپنے علاقے کی محبت نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں تک کہ جب اسے علم ہوتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے اور ہندوستان بھیجا جا رہا ہے تو اس نے ایک ایسی زمین پر اپنی جان دے دی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ لیکن اپنے علاقے سے دور جانا گوارا نہیں کیا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے بھائی اور رشتہ دار ہندوستان جا چکے ہیں۔ لیکن اسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔

بشن سنگھ عرف ٹوبہ ٹیک سنگھ کے کردار کی پیش کس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مسلمانوں اور پاکستان میں چھوڑ کر جانے والے سکھوں اور ہندوؤں کو ان کی فطرت کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت دی جاتی، تو وہ بھی بشن سنگھ کی طرح جان دینا گوارا کر لیتے لیکن اپنا علاقہ نہ چھوڑتے۔ گویا یہ تمام پاگل جو اس کہانی میں شامل ہیں، سچائی اور عوام کی دل کی آواز پر قائم تھے اور وہ تمام باشعور رہنما اور عوام جو اس تقسیم کے ذمہ دار تھے ایک غیر فطری اور مصنوعی کام کرنے کے مرتکب ہوئے۔

آدمی نامہ

نظیر اکبر آبادی نے اس نظم میں انسان کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جو دولت اور غربت، نیکی اور بدی، بادشاہی اور فقر اور ولایت اور بدتری سے ماوراہے۔ اس دنیا میں یہ انسان کئی رنگوں میں نظر آتا ہے۔ اگر برائی پر مائل ہو اور خدا کا انکار کرنے پر آجائے تو فرعون اور نمرود کی طرح باغی اور گستاخ بھی ہو سکتا ہے اور اگر یہ انسان نیکی پر آمادہ ہو تو غوس، قطب اور ابدال جیسا ولی اللہ بھی بن سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں تمام رسوم ورواج، تمام کاروبار اور تمام اچھی بُری سرگرمیاں آدمی ہی کی وجہ سے ہیں۔ کبھی یہ آدمی ہیروں اور موتیوں کی طرح قیمتی اور جگمگاتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کبھی یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ خاک سے بھی بدتر ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس کے مرتبے، اسکی دولت اور اس کے دین ومذہب سے جدا کر کے دیکھنا چاہئے کہ وہ بحیثیت انسان کیسا ہے۔

یہ نظم اکبر آبادی کی وسیع المشربی اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی تہذیب کے عام انسانوں کی نمائندگی کی اور یہ دیکھا کہ ہر انسان اپنے اندر ایک نئی دنیا بسائے رکھتا ہے۔ میر تقی میر نے کہا تھا کہ:

سرسری تم جہان سے گزرے

ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

نظیر نے اپنی اس نظم میں انسان کی فطرت، اس کی نفسیات اور اس کے مشاغل کا مشاہدہ اس انداز میں کیا ہے کہ جیسے ہر انسان ایک نیا جان ہو۔ چنانچہ انسان کو صرف ایک آدمی کی حیثیت سے جانچا اور پرکھا ہے۔ اردو ادب میں اس نویت کی شاعری کی یہ پہلی مثال ہے۔

روٹیاں

نظیر کی نظم "روٹیاں" بظاہر بڑی سادہ سی نظم ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظم میں انسانی نفسیات کا انتہائی گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ غذا انسان کی اولین ضرورت ہے اور غذا کے بغیر تمام زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ بات بڑے بڑے نفسیات دانوں اور ماہرینِ معاشیات نے کہی ہے لیکن نظیر کا اپنا عوامی انداز ہے۔ یہ نظم اس بات کی مثال ہے کہ نظیر کس طرح بڑے سادہ اور روزمرہ کے مشاہدے سے فلسفیانہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ پوری نظم کا لُبِ لباب یہ ہے کہ اگر انسان کو روٹی ملتی رہے تو اس کے

نزدیک زندگی کی خوشیاں، عیش و عشرت، عبادات اور عقائد اہمیت رکھتے ہیں۔ اور پیٹ میں روٹی نہ ہو تو یہ سب چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں لوگ مختلف حیلوں اور بہانوں سے روٹی کمانے کا جتن کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے اچھے بُرے پیشے اپنائے جاتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے بڑی تگ ودو کی جاتی ہے۔ اس طرح روٹی اس دنیا کی سب سے اہم چیز قرار پاتی ہے۔

یہ نظم بھی نظیر کے عوامی انداز کی مثال ہے۔ انہوں نے روٹیوں کی اہمیت اس لیے سمجھی کہ یہ غریب آدمی کا مسئلہ ہوتی ہیں اور وہی جان سکتا ہے کہ روٹی نہ ہو، تو زندگی کیسے گزرتی ہے۔ شرافت اور نجابت کا تمام انحصار روٹی ملنے پر ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی خاطر انسان اپنے آپ کو نوکر تک بنانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام انسان کے لیے ہر طرح کی روٹی اہمیت رکھتی ہے۔

تندرستی

نظیر اکبر آبادی کی نظم "تندرستی "ایک معاشرتی عقیدت (دارالمکافات) پر مبنی نظم ہے جو درحقیقت ایک نصیحت ہے۔ نظیر نے اپنے زمانے مین عوام میں رہ کر زندگی گزاری اور اپنی نظموں میں وہ حکمت ودانائی پیش کی جو عوام میں مقبول ہوتی ہے۔ تندرستی اور صحت اللہ کی ایک نعمت ہے اور انسان اپنے مال ودولت، اپنے مقام اور مرتبے اور حلقہ احباب سے اُسی وقت لطف اندوز ہو سکتا ہے جب وہ تندرست ہو۔ نظیر نے اس نظم میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ تندرستی کے بغیر بادشاہت اور عیش و عشرت سب کچھ بے کار ہے۔ اگر خدا انسان کو عزت و آبرو سے صحت مند رکھے تو اس سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں۔

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

اس نظم میں اقبال نے اس دنیا میں انسان کی ودیعت کا مقصد بیان کیا ہے۔ کہ جب انسان اپنے خالق سے جدا ہو کر اس کرہِ ارض پر آیا تو زمین نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اے انسان اپنے خالق سے جدائی کے اس سخت زمانے میں تو خوف اور امید کی کئی منزلوں سے گزرے گا۔ اس عرصے کے دوران اس زمین پر جتنے مظاہر فطرت ہیں، وہ سب تیرے استعمال میں ہوں گے اور یہاں تیری صلاحیتوں کا امتحان ہو گا اگر تو اپنی خودی تعمیر کرے گا اور خدا سے لو لگائے گا تو یہ دنیا تیری اطاعت کرے گی۔ ستارے تجھ پر رشک کریں گے اور تیری فکر کا دائرہ سمندر سے بھی وسیع اور بے کنار ہو جائے گا۔

اقبال نے انسان کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ انسان محنت اور مسلسل کوشش کرے، تو اپنے ہنر سے ایک نیا جہان پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس انسان کے جذبے میں سورج کی روشنی جیسی چمک ہے۔ اگر انسان کو اپنی محنت پر اعتماد ہو، تو وہ خدا کی بخشی ہوئی جنت قبول کرنے سے انکار کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر انسان روحانی سطح پر محنت کرے، تو پھر وہ اس دنیا کی تقدیر کا مالک بن سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

عبث شکوہِ تقدیرِ یزداں

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

بچہ اور شمع

اقبال نے اس نظم میں ایک منظر پیش کیا ہے کہ ایک بچہ شمع کے شعلے کو غور سے دیکھتا رہتا ہے اور اسے پکڑ لینا چاہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شمع کا یہ شعلہ اس کی کوئی دیکھی ہوئی چیز ہے جس کی کشش اسے بے تاب کر دیتی ہے۔ یہاں سے اقبال یہ فلسفہ پیش کرتے ہیں کہ شمع کا یہ شعلہ بہت حسین ہے۔ لیکن اس بچے کے دل میں چمکنے والا نور اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ ہم اپنی زندگی میں الجھ کر اپنے دل کی خوبصورتی فراموش کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ علم انسان کے عشق پر پردے ڈال دیتا ہے۔ دنیا میں ہر طرف خوبصورتی موجود ہے۔ پہاڑ، سورج، آسمان، رات اور قدرت کے نظارے سب چیزیں بہت خوبصورت ہیں لیکن انسان کی روح ہر وقت بے چین رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے کسی گم شدہ چیز کی تلاش ہو اقبال نے اس گم شدہ چیز کی طرف اس

طرح اشارہ کیا ہے کہ ایک معصوم بچہ شمع کے شعلے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی شعلے کی یہ کشش انسان کی فطرت کا حصّہ ہے۔ انسان کے دل میں عشق کا وہ شعلہ ہوتا ہے جو اس دنیا میں اسکی متاعِ گم گشتہ ہے جس کی تلاش میں اس کی روح بے چین رہتی ہے۔

ایک آرزو

انسان کی سرشت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ہمیشہ فطرت کے قریب رہنا چاہتا ہے۔ شہری زندگی سے راز اور معاشرتی اصولوں سے بیزاری انسان کی عادت میں شامل ہے۔ اردو شاعری میں کلاسیکی دور سے اب تک اس کے ثبوت ملتے ہیں مثلاً مومنؔ نے کہا تھا:

؎ کر علاج وحشتِ غم چارا گر

لادے ایک جنگل مجھے بازار سے

اقبالؔ کی زیرِ نظر نظم میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کی ابتدائی دور کی شاعری میں رومانی رجحانات غالب تھے اور انہوں نے ایسی بہت سی نظمیں لکھیں جن میں یہ خواہش نظر آتی ہے۔ فطرت کے ساتھ ان کا تعلق بہت گہرا تھا اور ان کی نظموں میں اس کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ زیرِ نظر نظم میں انہوں نے بڑی شدت سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ شہر میں رہنے کی بجائے کسی جنگل میں ایک جھونپڑی بنا کر رہتے اور مصنوعی زندگی کی بجائے ایک فطری زندگی گزارتے۔ یہ وہ زندگی ہوتی جس میں وہ اپنے دل کی خواہش کے مطابق زندہ رہ سکتے۔

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اقبالؔ کی منظر نگاری ہے۔ وہ اپنی خواہش کو مختلف مناظر کے روپ میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اکثر اوقات بڑی منفرد مثالیں بناتے ہیں۔ اس نظم میں بھی انہوں نے بہت تمثالیں پیش کی ہیں۔ رومانی شاعری کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے آزادانہ تخیل کے ساتھ فطرت کے قریب رہ کر ایک ایسی دنیا تخلیق کرے جہاں کوئی خواہش نہ ہو اور کوئی معاشرہ اسے کسی بات پر پابند نہ کرے۔ اسی لیے اقبالؔ نے خود شہر سے دور رہنے کی دعا کی ہے۔

نثار میں تیری گلیوں پر

بند نمبر 1: اے میرے وطن میں تیری ان گلیوں پر قربان جاؤں جہاں اب یہ سلسلہ چل نکلا ہے کہ کوئی انسان بھی عزت نفس کے ساتھ سر اٹھا کر نہ جی سکے اور تیرے چاہنے والے جب تجھے دیکھنے کے لیے آنا چاہیں تو چھپ کر اور اپنے آپ کو بچا کر آئیں کیونکہ اب تجھ سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ پتھر قید کر دیے گئے ہیں اور کتے کھلے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

یہ فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ انہوں نے در حقیقت حکمرانوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ لوگ جو اس وطن سے پیار کرتے ہیں اور اسے خانہ کعبہ کی طرح چاہتے ہیں، حکمرانوں کے ظلم کا شکار ہیں اس لیے کہ حکمران نہیں چاہتے کہ یہاں کسی کی عزتِ نفس قائم رہے۔ وطن کے دشمن آزاد ہیں اور ان کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے ہاتھ باندھ دیے گئے ہیں اس طرح وطن سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔

بند نمبر 2 ظلم کرنے والے لوگ ظلم کے لیے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ابھی تک وطن کا نام لیتے ہیں۔ یہ لوگ ان ظالموں کے لیے کافی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دولت اور اقتدار کی ہوس میں مبتلا لوگ اپنی حب الوطنی کا دعوٰی بھی کرتے ہیں اور اپنے حق میں فیصلہ بھی خود ہی دے لیتے ہیں۔ وطن سے محبت کرنے والوں کا نا تو کوئی وکیل ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ادارہ ہے جہاں سے وہ انصاف طلب کر سکیں۔ لیکن اس وطن میں رہنے والے اپنے دن اِس طرح بھی گزار ہی لیتے ہیں۔ فیض نے اس بند میں حکمرانوں کے اندازِ حکومت اور ملک میں انصاف کی عدم دستیابی پر احتجاج کیا ہے۔

بند نمبر 3۔ فیض کے ظلم کے خلاف احتجاج پر حکمران انہیں قید کر دیتے تھے اور اس بند میں واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فیض قید خانے میں ہیں اور وطن سے دوری کا شکار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وطن سے جدائی کے یہ دن یوں گزرتے ہیں کہ جب قید خانے کے درودیوار میں موجود کسی چھوٹے سے سوراخ سے روشنی آنا بند ہو جاتی ہے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اب وطن میں شام ہو گئی ہو گی اور جب ہماری زنجیریں چمکنے لگتی ہیں، تو ہم جان جاتے ہیں کہ اب وطن میں صبح ہو گئی ہو گی۔ وطن کی حقیقی صبحیں اور شامیں ہمارے نصیب میں نہیں رہیں صرف ایک تصور ہے جس میں ہم جیے جا رہے ہیں اور اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے قید خانے

کے درودیوار کے سایوں نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ فیض نے اپنی جیل کی زندگی کو وطن میں رہنے والے عوام کی مجموعی زندگی سے ملا دیا ہے۔

بند نمبر 4۔ فیض کہتے ہیں کہ اے وطن اگرچہ ہم تجھ سے جدا ہیں، لیکن ہم نے کبھی اپنی قسمت سے شکایت نہیں کی اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ صدیوں سے ظلم کا سلسلہ جاری ہے اور اللہ کی مخلوق ظلم سے ٹکراتی رہی ہے نہ ظلم کی رسم نئی ہے، اور نہ ہی ظلم کے خلاف لڑنے والوں کی روایت ہم نے ہمیشہ ظلم کی آگ میں پھول کھلائے ہیں اور حضرت ابراہیم کی طرح ظلم کو شکست دی ہے۔ اس لیے ہم جانتے ہیں کہ آخر کار فتح ہماری ہو گی۔ یہاں فیض نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ قید و بند کی یہ مشقت انہیں اس لیے گوارہ ہے کہ ان کے دل میں امید کی روشنی ہے او وہ جانتے ہیں کہ آخر کار انہیں کامیابی ملے گی۔

بند نمبر 5۔ فیض نے ایک بار پھر امید کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے وطن اگر ہم آج تجھ سے دور ہیں تو کیا ہوا۔ دو چار دن کی جدائی کوئی حیثیت نہیں رکھتی کل ہم پھر تیرے قریب ہوں گے اور اگر آج دشمنوں کی قسمت کا ستارہ عروج پر ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ ان کی حکمرانی ہمیشہ باقی نہیں رہے گی وہ لوگ جو اپنے وطن سے وفاداری کے وعدے پر قائم رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بد قسمتی کے ان دنوں کا علاج کیسے کرنا ہے۔ یعنی وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے کبھی ناامید نہیں ہوتے۔

مجھ سے پہلی سی محبت

فیض احمد فیض کی یہ نظم ترقی پسند تحریک کے منشور کے عین مطابق ہے۔ ترقی پسند تحریک کا منشور یہ تھا کہ شاعری اور ادب میں شاعر کو اپنے ذاتی جذبات اور ذاتی عشق و محبت کی نمائندگی کرنے کی بجائے معاشرے کے دکھ اور غم پر توجہ دینی چاہئے۔ فیض نے اس نظم میں کلاسیکی دور سے جدید دور تک کے شعرا کی نمائندگی کرتے ہوئے اس فرضی محبوب کو مخاطب کیا ہے۔ جس کی محبت اور جس کے ہجر میں کلاسیکی شاعروں نے دیوان لکھے تھے۔ کلاسیکی دور میں یہ محبوب ایک طوائف کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ فیض نے اس محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے بطور شاعر یہ سمجھا تھا کہ تیرے وجود سے میری زندگی روشن ہو جائے گی اور اگر میں تیرے عشق میں کامیاب ہو گیا، تو اس دنیا کے سارے غم ختم ہو جائیں گے۔ میرا یہ خیال تھا کہ زندگی کی تمام خوشیاں تیرے ہونے سے عبارت ہیں۔ اور اگر تو مل جائے تو میری تقدیر میرے سامنے جھک جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ بلکہ یہ میرا خیال تھا اور میری خواہش تھی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

دوسرے بند میں فیض نے وہ حقیقت بیان کی ہے جس کا سامنا ہم عملی زندگی میں کرتے ہیں۔ کلاسیکی دور میں شاعروں نے جس طوائف کو محبوب کا درجہ دے رکھا تھا، اس کی حقیقت یوں ہے کہ یہ عورتیں بے شمار صدیوں کے ظلم سے پیدا ہونے والا ایسا جادو ہیں جسے ریشم اور کمخواب جیسے قیمتی کپڑوں میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ مٹی اور خون میں لتھڑ؟ے ہوئے وہ جسم ہیں جو ہمارے معاشرے کے بازاروں میں بکتے ہیں۔ کلاسیکی دور کے شاعر نے اس عورت کا ظاہری روپ دیکھا تھا لیکن جدید دور کا شاعر اسکی حقیقت پر نظر رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس محبوب کا ظاہری روپ آج بھی بہت دلکش ہے لیکن موجودہ دور میں شاعر اتنا باشعور ہو چکا ہے کہ وہ معاشرے کے ظاہر کی بجائے اس کے باطن پر توجہ دے سکے۔ اور اگر دیکھا جائے تو اس زندگی میں عیش و عشرت اور عشق و محبت کے علاوہ بھی بہت سی ایسی تلخ حقیقتیں ہیں انسانیت کے بہت سے ایسے دکھ ہیں جن کا مداوا کر کے انسان راحت حاصل کر سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سچی خوشی وہی ہو گی جو معاشرے کے ان دکھوں کا مداوا کرنے سے ملے۔ اسی لیے فیض نے اس فرضی محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے اب میں تمہارے ساتھ ویسی محبت نہیں کر سکتا جیسی پہلے کیا کرتا تھا۔

چند روز ار میری جان !فقط چن ہی روز

بند نمبر 1۔ شاعر اس بند میں عروم ونادار اور نچلے طبقے سے مخاطت ہوتے ہیں۔ وہ اس طبقہ کے ساتھ کیے جانے والے مظالم کے نتیجے میں بہنے والے آنسوؤں کا ذکر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیسے امراء جو کہ اس غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، مسلسل ظلم وستم کا شکار ہیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم یہ تمام تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ یہ رونا، یہ تڑپنا، سب ہمیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملاہے۔ یہ تو ہمارا تر کہ ہے یہ ظلم وستم تو ہم نسل در نسل سہتے آئے ہیں۔ آخر ہم بھی کیا کریں۔ ہمارے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔ ہم تو بے کس ولاچار ہیں۔ ہمارے جسم بھی پابند ہیں اور ہمارے جذبات بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ نہ تہ ہم اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ نہ ہی جفا کے خلاف آواز اٹ ؟ھا سکتے ہیں۔ زبان کو تو قید کیا ہی ہے، اب تو ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر بھی تالے لگائے جارہے ہیں۔ اگر ہم اپنی اظہارِ رائے کی محض کوشش ہی کریں تو، ہمیں سزائیں اور تعزیریں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ہمیں سوچنے سمجھنے کی اجازت نہیں۔ ہماری طاقتِ گفتار کو بھی کمزور کر دیا گیاہے۔

بند نمبر 2۔ ایسے تمام افراد کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی داد دیتے ہوئے فیض کہتے ہیں کہ ایسے تمام تر مصائب اور تکالیف کے باوجود اگر ہم آج بھی زندہ ہیں تو وہ محض اپنی ہمت وطاقت کی وجہ سے ہیں۔ یہ ہمارا اپنا حوصلہ ہی ہے کہ ہم ان تمام حالات کا

سامنا پوری استقامت اور قناعت پسندی سے کر رہے ہیں۔ ہم اپنی ہمت و قوت کے بل بوتے پے ہی تو زندہ ہیں۔ فیض استفہامیہ انداز اپناتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ کیا ہماری زندگی کسی غریب کے لباس کی مانند ہے جس پے جو چاہے جب چاہے، دکھ و درد کا ایک پیوند لگا جاتا ہے۔ ہر گھڑی ہماری زندگی میں کوئی نیا غم جنم لیتا ہے کوئی نئی مشکل در پیش ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی، زندگی نہیں بلکہ ایک غریب کا لباس ہے جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری زندگی میں پھر کبھی خوشی نہ آئے گی۔ ذرا صبر اور تحمل سے کام لو۔ بے شک ہمیں ان مشکل حالات میں جینا ہے، اس تمام تکلیف کو برداشت کرنا ہے۔ لیکن یہ دائمی تو نہیں۔ ایک نہ ایک دن تو اس ظلم و ستم کا خاتمہ ہونا ہی ہے اور وہ دن دور نہیں۔ اب ظلم کے دن اپنے اختتام کو پہنچ رہے ہیں اور نئی صبح کا روشن سورج طلوع ہونے کو ہے۔

بند نمبر 3۔ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ آج ہم ایک ایسے ویران میدان میں کھڑے ہیں جسے وقت اور حالات کے شعلوں نے جلا کر بھسم کر دیا ہے۔ جہاں لہلہاتے ہوئے سبز و شاداب پیڑ پودوں کی بجائے ہر شے ظلم کی آگ سے جھلس گئی ہے۔ جہاں صرف ویرانی اور تنہائی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کبھی اس سے نجات نہ پائیں گے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم تا قیامت ایسی ہی درد ناک اور ہیبت ناک زندگی بسر کریں گے۔ آج یہ جو اونچے طبقے کے افراد ہماری مشکلات سے بے خبر ہم پر ظلم و ستم کی برسات کرتے چلے آ رہے ہیں۔ چند روز بعد ایسا نہ کریں گے۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ وقت بدلنے میں دیر بھی نہیں کرتا ہے۔ بے شک آج تمہیں ان جفاکاروں کا ظلم سہنا پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ حالات مستقل تو نہیں۔ کب تک یہ اجنبی ہاتھ ہم پر ستم ڈھائیں گے۔ ایک نہ ایک دن تو اس سب کا خاتمہ ہو گا اور وہ دن دور نہیں۔ فیض نے یہاں پر قوم کے امراء کو امید دلائی ہے کہ حالات کی بہتری انتہائی زیادہ حد تک ممکن ہے۔ یہاں پر فیض بہتری کا عزم کرتے ہیں۔

بند نمبر 4۔ فیض نے اپنی دھرتی، اپنے معاشرے اور اپنے لوگوں کو ایک محبوبہ کے استعارے سے ظاہر کتے ہوئے کہا ہے کہ آج تیرے حسن پر غم و آلام کی گرد ہے اور آج تو اپنی زندگی میں صرف اپنے ٹوٹنے اور ہارنے کا شمار کرتی رہتی ہے لیکن یہ صرف چند روز کی بات ہے۔ راتوں کا جاگنا اور درد سہنا اور اپنے دل میں تڑپ رکھنا آخر کار فائدہ مند ثابت ہو گا اور یہ ہجر کی رات ختم ہو جائے گی۔ بنیادی طور پر فیض ایک امید زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ خراب حالات ہمیشہ رہنے والے نہیں اور وہ لوگ جو استعمار کے ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ پریشان نہ ہوں کیونکہ ان کی منزل قریب ہے۔